ماہنامہ
جہد حق

پاکستان کمیشن
برائے انسانی حقوق

Monthly JUHD-E-HAQ - November-2019 - Registered No. CPL-13

(قیمت10روپے)

جلدنمبر26......شمارہ نمبر11......نومبر2019

ریاست کا کام قتل نہیں حفاظت ہے

لاہور، 06 اکتوبر 2019: ایچ آر سی پی کا کونسل اجلاس 2019

لاہور، 06 اکتوبر 2019: ایچ آر سی پی نے ''بنیادی آزادیوں پر پابندیوں کے خلاف جدوجہد کی ضرورت'' کے موضوع پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا

فہرست

پریس ریلیزیں 03

سزائے موت کے خلاف عالمی دن 06

بلوچستان میں کوئٹہ کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے مسائل 07

ایک عوامی مکالمہ 08

مسلم ذہن کا جمود؛ اپنے علمی وفکری بحران پر ایک نظر 09

پاکستان میں بنیادی آزادیوں پر پابندی کے خلاف جدوجہد کی ضرورت 12

مزاحمت کی درخشاں ہم اپنی نئی نسل کی بچیوں کو صدیوں پیچھے دھکیلنا چاہتے ہیں 14

مرنے کے بعد خواجہ سرا کا اپنی ماں کو خط 15

بچے کے ساتھ جنسی زیادتی 16

بلوچستان یونیورسٹی: 'طالبات ہراسانی کیس میں جو دعوے سامنے آئے خدا کرے درست نہ ہوں 17

پاکستان میں 5 برس کے دوران 33 صحافی قتل کر دیئے گئے 18

19

پاکستان: سزائے موت کا سب سے زیادہ نشانہ غریب اور محروم طبقوں کے لوگ بنتے ہیں

ایف آئی ڈی ایچ اور اس کی رکن تنظیم پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے آج جاری ہونے والی اپنی ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ پاکستان میں سزائے موت کے حوالے سے غریب اور پسے ہوئے طبقے کے لوگوں کو انتہائی منظم تعصب کا سامنا ہے۔ سزائے موت کے خلاف عالمی دن (10 اکتوبر) سے قبل شائع ہونیوالی رپورٹ میں پاکستانی حکومت سے فوجداری نظامِ انصاف میں اصلاحات لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے تاکہ قواعد وضوابط اور پالیسی سے متعلقہ اُن مسائل کو ختم کیا جاسکے جن کی وجہ سے معاشرے کے پسے ہوئے لوگ موت کی سزا اور پھانسیوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔

"بے دست و پا ہونے کے سبب مستوجب سزا ٹھہرے: پاکستان معاشرے کے غریب ترین اور پسے ہوئے لوگوں کو کس طرح تختہ دار پر لٹکاتا ہے"، نامی رپورٹ ایک تحقیق پر مبنی ہے جو دو تنظیموں نے نومبر 2018 میں پاکستان میں سزائے موت کے مسئلے کا مفصل جائزہ لینے کے لیے کی تھی۔ تحقیق میں سزائے موت والے جرائم کے ملزمان کے شفاف ٹرائل کے حق، جیل میں سزائے موت کے قیدیوں کی حالت، کم عمر بچوں کو موت کی سزا کا سنایا جانا اور انہیں کی پھانسی کے پھندے پر لٹکانا، اور سزائے موت کے قیدیوں کے اہلخانہ پر اُن کی سزا کے اثرات پر توجہ مرکوز کی گئی تھی۔ ایک تکلیف دہ حقیقت جو پوری تحقیق کے نتیجے میں سامنے آئی وہ یہ تھی: معاشی لحاظ سے کمزور طبقے اور معاشرے کے دیگر محروم حلقے پاکستان کے فوجداری نظامِ کے نقائص کا زیادہ نشانہ بن رہے ہیں۔

ایف آئی ڈی ایچ کے سیکریٹری جنرل شوان جبارن نے کہا، "یہ انتہائی تشویش ناک بات ہے کہ پاکستان میں اُن لوگوں کو موت کی سزا کا نشانہ بنانے کے زیادہ امکانات ہیں جو معاشرے کی نچلی سطح سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ سزائے موت جہاں کہیں بھی لاگو ہو وہاں انتہائی بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کا سبب بنتی ہے مگر پاکستان میں اس کا امتیازی اطلاق خاص طور پر باعثِ تشویش ہے"۔

پاکستان کا فوجداری نظامِ انصاف اِس وقت جس طرح رائج ہے۔۔۔۔ پولیس کی تحقیقات سے لے کر مقدمہ سازی اور عدالتی ٹرائل تک، اس میں اس چیز کے قوی امکانات ہیں کہ معاشرے کے سب سے پسماندہ طبقے دباؤ کے تحت اعترافِ جرم کریں گے، عدالتوں میں غیر منصفانہ ٹرائل کی زد میں آئیں گے، اور موت کی سزا کا نشانہ بنیں گے۔ وہ غیر معمولی طور پر منظم تعصب کا نشانہ بنتے ہیں اور یہ چیز انہیں قانونی چارہ جوئی کی بے ضابطگیوں اور پھانسی کے پھندے کے اور زیادہ قریب کر دیتی ہے۔

پاکستان میں موت کی سزا سزائے موت کے قیدیوں کے اہلِ خانہ پر بہت زیادہ سنگین اور دوررس اثرات مرتب کرتی ہے۔ اِن میں سماجی و معاشی اثرات بھی شامل ہیں۔ سزا یافتہ لوگ عام طور پر اپنے گھرانوں کی کمائی کا واحد ذریعہ ہوتے ہیں۔ اِس کے علاوہ قانونی کارروائیاں جو سالہا سال چلتی رہتی ہیں، سزائے موت کے قیدیوں کے خاندانوں کو سخت معاشی نقصانات سے دوچار کرتی ہیں۔ مزید برآں، یہ تکلیف دہ عمل نفسیاتی درد کا سبب بھی بنتا ہے۔ سزائے موت کے ایک قیدی کی شریکِ حیات نے اپنے خاوند کی قید کے اثرات بیان کرتے ہوئے کہا: "(میرا خاوند) 27 برسوں سے جیل میں ہے۔ وہ جیل کے اندر سزا بھگت رہا ہے اور میں جیل کے باہر سزا بھگت رہی ہوں"۔ اگرچہ حالیہ برسوں میں پاکستان میں پھانسیوں میں کمی واقع ہوئی ہے مگر اس کے باوجود ملک کا شمار دنیا کے اُن ممالک میں ہے جہاں سب سے زیادہ لوگ تختہ دار پر لٹکائے گئے ہیں۔ دسمبر 2014 میں پھانسیوں پر پابندی کے خاتمے سے لے کر اگست 2019 تک ملک کی عدالتوں نے لگ بھگ 1800 افراد کو سزائے موت سنائی ہے اور 520 افراد کو پھانسی دی گئی ہے۔ پاکستان میں 32 جرائم کے لیے موت کی سزا لاگو ہے جن میں سے کئی ایسے جرم ہیں جو "عالمی قانون کے تحت انتہائی سنگین جرائم کی تعریف" پر پورا نہیں اترتے۔

اِس رپورٹ سے پہلے ایف آئی ڈی ایچ - ایچ آر سی پی نے جنوری 2007 میں، "بوجھل قدموں کے ساتھ پھانسی گھاٹ کی طرف روانگی" شائع کی تھی۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 08 اکتوبر 2019]

بلوچستان کو نظر انداز کیے جانے کی روش جاری ہے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے اپنے فیکٹ فائنڈنگ مشن کے دورہ بلوچستان کے بعد "بلوچستان: تاحال نظر انداز" کے عنوان سے جاری ہونے والی رپورٹ میں کہا ہے کہ سیاسی اعتبار سے، بلوچستان کے ساتھ اب بھی غیر منصفانہ سلوک برتا جارہا ہے۔

لوگوں کو اٹھا کر غائب کرنے کا سلسلہ جاری ہے: متاثرین کے اہلِ خانہ کے بقول، وہ عام طور پر حکام کو اپنے پیاروں کی جبری گمشدگی کے بارے میں بتانے سے ڈرتے ہیں۔ اس معاملے کا الم ناک پہلو یہ ہے کہ کئی علاقوں جیسے کہ ڈیرہ بگٹی اور آواران میں اب عورتیں بھی 'لاپتہ' ہو رہی ہیں۔ اس کے باوجود ایسے واقعات نہ تو رپورٹ ہو رہے ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی ریکارڈ مرتب ہو رہا ہے۔ ایچ آر سی پی کی تحقیقات سے یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ کوئلے کی سینکڑوں کانیں ایسے لوگ چلا رہے ہیں جن کے پاس کانوں میں حفاظتی اقدامات کرنے یا ہنگامی صورتحال سے نبٹنے کے لیے نہ تو مالیاتی وسائل ہیں اور نہ ہی ٹیکنیکل صلاحیت ہے۔ مشن کو پتہ چلا کہ سکیورٹی فورسز فی ٹن پیداوار پر سکیورٹی محصول وصول کرتی ہیں جو سرکاری طور پر لاگو نہیں ہے۔ اور کانوں کے مالکان اور مزدور یونینوں کی نظر میں یہ بھتہ ہے۔ ایچ آر سی پی سمجھتا ہے کہ فرنٹئر کور کی بہت بڑی تعداد کی بلوچستان میں موجودگی اور صوبے کے معاملات پر بہت زیادہ کنٹرول صوبائی حکومت اور سویلین انتظامیہ کے لیے شدید نقصان کا سبب ہے۔ تعلیمی اداروں جیسے کہ بلوچستان یونیورسٹی میں سیکیورٹی اہلکاروں کی غیر ضروری مداخلت اور مستقل موجودگی بھی ختم ہونی چاہیے۔

ایچ آر سی پی کا یہ بھی ماننا ہے کہ صوبے کے معاملات صوبائی حکومت اور سویلین انتظامیہ کو چلانے چاہیں اور ان معاملات میں کسی اور ادارے کی ناجائز مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ، جبری گمشدگیوں کو جرم قرار دینے، مجرموں کو سزا دلوانے اور متاثرین کے خاندانوں کی دادرسی کے لیے فوری طور پر قانون سازی کی جائے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 02 اکتوبر 2019]

پارلیمنٹ کا کردار غیر مؤثر نہیں ہونا چاہیے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے اپنے ششماہی اجلاس کے اختتام پر درج ذیل بیان جاری کیا ہے:

'ہمیں سیاسی اختلاف رائے کو دبانے کی حالیہ حکومتی کوششوں پر سخت تشویش ہے۔ اس بات کے پریشان کن اشارے موجود ہیں کہ پارلیمنٹ کا کردار کم ہوتا جا رہا ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ حکومت آرڈیننس کے ذریعے نظام حکومت چلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ حال ہی میں نافذ کیا گیا خیبر پختونخوا ایکشنز (اِن ایڈ آف سول پاور) آرڈیننس 2019ء نہ صرف بعض بنیادی حقوق کے منافی ہے بلکہ یہ جمہوری اصولوں کے بھی خلاف ہے۔

'حکومت کو سپریم کورٹ کے 2014ء کے مذہبی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ سے متعلق فیصلے پر عمل درآمد کے لیے فوری اقدامات کرنا ہوں گے۔ ہماری رپورٹس ظاہر کرتی ہیں کہ پاکستان کی مذہبی اقلیتوں کو عقیدے پر مبنی تشدد اور توہین مذہب کے قوانین کے غلط استعمال کا شکار ہو رہی ہیں۔

'ایچ آر سی پی کے حالیہ فیکٹ فائنڈنگ مشن ظاہر کرتے ہیں کہ ریاستی عناصر جبری گمشدگیوں کو اب بھی جبر کے ذرائع کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ جبری گمشدگیوں کو جرم قرار دینے کے لیے قانون سازی کی اشد ضرورت ہے تاکہ مجرموں کو ایک منظم اور مؤثر طریقے سے جوابدہ ٹھہرایا جا سکے۔' بچوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات میں حالیہ اضافہ معاشرے میں بڑھتی ہوئی بربریت کو ظاہر کرتا ہے۔ بچے غیر محفوظ ترین گروہوں میں شامل ہیں، اور ریاست اور معاشرے دونوں کو ہی ان کے تحفظ کی ذمہ داری لینا ہوگی۔

'ہم ریاست کی جانب سے میڈیا ٹرائبونلز کے قیام کے ذریعے اظہار رائے کی آزادی کو دبانے یا میڈیا کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی کوششوں کی سخت مذمت کرتے ہیں۔

'ہم ریاست پر زور دیتے ہیں کہ وہ گلگت-بلتستان کو صوبے کا درجہ دے اور یقینی بنائے کہ اس کے لوگوں کو ان تمام بنیادی حقوق تک رسائی حاصل ہو جو پاکستان کے دیگر شہریوں کو حاصل ہیں۔

'ہمارے لیے یہ امر پریشان کن ہے کہ خیبر پختونخوا حکومت کی جانب سے طالبات میں برقعے تقسیم کیے جانے کی شکل میں انتہا پسندی دوبارہ سر اٹھا رہی ہے۔ ایسے اقدامات خواتین کی آزادیوں کو محدود کرنے کی واضح اور طالبانائزیشن کے فروغ کی ایک دانستہ کوشش ہے۔

'حکومت صحت اور تعلیم کے لیے مزید فنڈز مختص کرنے کی بجائے ان شعبوں کے وسائل میں کمی کی جانب مائل دکھائی دیتی ہے۔ ہم حکومت کو یاد دلاتے ہیں کہ ریاست کی یہ آئینی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو تعلیم تک رسائی دے اور اس کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک بھر میں صحت کی معیاری سہولیات کی فراہمی کے لیے تمام ممکنہ اقدامات کرے۔

'ہمیں ہندوستانی حکومت کی جانب سے کشمیر میں لاک ڈاؤن پر گہری تشویش ہے۔ اس اقدام کی وجہ سے انسانی حقوق کا بحران پیدا ہو چکا ہے۔ ہمیں سرحد کی دونوں اطراف سے جاری ہونے والے جنگ سے متعلق بیانات پر بھی سخت تشویش ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں کو فوری طور پر تسلیم کرنا ہوگا کہ کشمیر کے عوام کو خودارادیت کا حق حاصل ہے اور یہ کہ علاقائی امن کا تحفظ اور فروغ دونوں ممالک کی ذمہ داری ہے۔' ہم ماحولیاتی تبدیلی پر قابو پانے کے حوالے سے عالمی اور ملکی تحاریک کے ساتھ اظہار یکجہتی کرتے ہیں اور ریاست پر زور دیتے ہیں کہ وہ اس انتباہ پر توجہ دے کہ اگر اس نے ماحول کو پہنچنے والے ناقابلِ تلافی نقصان پر قابو پانے کے لیے اقدامات نہ کیے تو اس کے نتیجے میں مستقبل کی نسلیں زندگی کے حق سے محروم ہو جائیں گی۔'

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 06 اکتوبر 2019]

صحافی مدثر نارُ کو بازیاب کیا جائے

لکھاری، شاعر اور صحافی مدثر نارُ کی جبری گمشدگی کا معاملہ شدید تشویش کا باعث بنا ہوا ہے، نہ صرف ان کے اہلِ خانہ کے لیے بلکہ سول سوسائٹی اور مجموعی طور پر پورے ادبی حلقے کے لیے۔ مدثر نارُ کی گمشدگی کے وقوعے پر تین ادبی اداروں نے قراردادیں منظور کی ہیں۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) اُن کے بیان کی پُرزور تائید کرتا ہے اور مدثر نارُ کی بحفاظت واپسی کے لیے مکمل تحقیقات کا حامی ہے۔

ایچ آر سی پی نے بارہا کہا ہے کہ پاکستان میں لاپتہ افراد کے حوالے سے حالات میں شدید قسم کا بدلاؤ آنا چاہیے۔ لوگوں کو اٹھا کر غائب کرنا غیر قانونی اور غیر انسانی فعل ہے، اور اس جرم میں ملوث مُجرموں کا محاسبہ کرنا بہت ضروری ہے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 11 اکتوبر 2019]

ایچ آر سی پی نے یونیورسٹی میں طالبعلموں کی کڑی نگرانی کی مذمت کی ہے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کو اِن الزامات پر شدید تشویش ہے کہ بلوچستان یونیورسٹی کی انتظامیہ سے منسلک عناصر یونیورسٹی کی نگرانی کے لیے بنائی گئی ویڈیوز کو طالبعلموں کو ہراساں اور بلیک میل کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ ان میں 'خفیہ' کیمروں سے بنائی گئی ویڈیوز بھی شامل ہیں۔

ایچ آر سی پی کے کوئٹہ جانے والے ایک حالیہ فیکٹ فائنڈنگ مشن کو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کے احاطے میں تشویشناک حد تک کڑی نگرانی کا سلسلہ جاری ہے۔ بظاہر تو یہ کام سیکیورٹی کے نام پر کیا جا رہا ہے مگر حالیہ شکایات سے پتہ چلتا ہے کہ نگرانی کا یہ نظام طالبعلموں کو ہراساں کرنے کا آسان ترین ذریعہ بن سکتا ہے، جس کا خاص نشانہ عورتیں بنتی ہیں۔ ایچ آر سی پی کے ذرائع کا دعویٰ ہے کہ نگرانی کا نظام یونیورسٹی میں اخلاقیات کے اطلاق کی خود ساختہ ذمہ داری کو پورا کرنے اور طالبعلموں کی صفوں میں ممکنہ سیاسی سرگرمیوں میں خلل ڈالنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور یہ کام مبینہ طور پر فرنٹیئر کور کے ایماء پر ہوتا ہے جو یونیورسٹی میں مستقل طور پر تعینات ہیں۔

یونیورسٹی میں خفیہ کیمرے نصب کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ ایچ آر سی پی اُن طالبعلموں کی حمایت کا اظہار کرتا ہے جن کا کہنا ہے کہ یہ عمل اُن کی نجی زندگی میں مداخلت اور جبر کا ذریعہ ہے۔ ایچ آر سی پی کے خیال میں بلوچستان ہائی کورٹ کی

طرف سے اس معاملے کا ازخود نوٹس لینا قابلِ تحسین اقدام ہے۔ کمیشن کی یونیورسٹی انتظامیہ سے بھی اپیل ہے کہ وہ اس میں ملوث لوگوں کی شناخت کر کے ان کے خلاف کارروائی کرے۔

[پریس ریلیز۔لاہور۔16 اکتوبر 2019]

حکومتی معاملات سے عوام کو بے خبر رکھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے

انسانی حقوق کے نامور کارکن اور ایچ آر سی پی کے اعزازی ترجمان آئی اے رحمان کا کہنا ہے کہ حکومت فیصلہ سازی اور ملکی نظم ونسق میں شفافیت برتنے کے بجائے تقریباً تمام سرکاری معاملات خفیہ انداز سے انجام دیتی نظر آ رہی ہے۔ اِن خیالات کا اظہار اُنہوں نے آج اسلام آباد میں ایچ آر سی پی کے 'عوامی آزادیوں کی واگزاری' کے موضوع پر ہونے والے ایک سیمینار میں کیا۔ ایک طرف ذرائع ابلاغ پر غیر معمولی سنسر شپ لاگو کی جا رہی ہے اور دوسری طرف عدلیہ، بار اور ٹریڈ یونینیں پھوٹ کا شکار نظر آ رہی ہیں جس سے بنیادی حقوق کی اجتماعی جدوجہد کمزور پڑ رہی ہے۔ شہریوں کو پارلیمان میں متعارف کروائے گئے قانونی مسودوں اور اپنی زندگیوں پر اثر انداز ہونے والی حکومتی پالیسیوں اور فیصلوں کے بارے میں جاننے کا مکمل حق ہے۔

شہزاد احمد، اِقبال خٹک اور مرتضیٰ سولنگی نے کہا کہ پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا میں اختلافی آوازوں کو خاموش کروا کے یا انہیں اپنے قابو میں لے کر آزادیِ اظہار کی راہ میں کھلی اور پوشیدہ رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہیں۔ آن لائن آزادیاں بھی سائبر بریگیڈز کے حملوں جن کے پیچھے بعض اوقات ریاستی اداروں کا ہاتھ ہوتا ہے، کے نشانے پر ہیں۔ ایڈووکیٹ حیدر امتیاز نے اُن آزادیوں اور حقوق کے تحفظ کے لیے قانون سازی کی ضرورت پر زور دیا جن کی آئین میں ضمانت دی گئی ہے۔ اُن کا مزید کہنا تھا کہ عدلیہ کے معاملات میں ریاستی اداروں، خاص طور پر گہری ریاست (state Deep) کی مبینہ مداخلت سنگین تشویش کا باعث ہے۔

روما نہ بشیر نے پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کی حالتِ زار پر روشنی ڈالی۔ مذہبی انتہا پسندی مسلسل جاری وساری ہے اور جبر کے آلے کے طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ قومی کمیشن برائے حقوقِ نسواں (این سی ایس ڈبلیو) کی چیئر پرسن خاور ممتاز نے کہا کہ عوامی مقامات پر بڑھتی ہوئی سرکاری پابندیوں کا سب سے زیادہ اثر سول سوسائٹی کے اداروں، خاص کر عورتوں کے حقوق کی تنظیموں پر پڑ رہا ہے۔ اُنہوں نے سیمینار کے شرکاء کو جبر کے خلاف مزاحمت میں عورتوں اور سول سوسائٹی کے نمایاں کردار کی یاددہانی بھی کرائی۔ طاہرہ عبداللہ نے تدریسی نصاب کو نفرت انگیز مواد سے پاک کرنے کی ضرورت پر زور دیا جو اُن کے بقول اسکول کی کُتب کا بدستور حصہ ہے اور متعصب سوچ کو پروان چڑھا رہا ہے۔

ایچ آر سی پی کے سیکریٹری جنرل حارث خلیق نے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ نہ صرف یہ احساس کرنے کی ضرورت ہے کہ بنیادی آزادیاں حملے کی زد میں ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ ٹریڈ یونینیں، پیشہ ورانہ انجمنیں، شہریوں کے ادارے، ماہرینِ تعلیم، ذرائع ابلاغ اور سیاسی جماعتیں وفاقیت، جمہوریت اور مساوی شہریت کو یقینی بنانے کے لیے کوئی اجتماعی حکمتِ عملی اختیار کریں۔ اُن کا یہ بھی کہنا تھا کہ ملک اور اس کے عوام کی بہتری کے لیے ضروری ہے کہ ریاستیں ناقدانہ آوازوں پر کان دھرے اور اپنی روش تبدیل کرے۔

[پریس ریلیز۔لاہور۔24 اکتوبر 2019]

حکومت کو کمزور بینائی کے حامل مزدوروں کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہیے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کمزور بینائی کے حامل افراد کے احتجاج کی حمایت کرتا ہے جنہوں نے چیئرنگ کراس لاہور پر احتجاجی دھرنا دیا ہوا ہے۔ صوبائی حکومت کے ملازمین پر مشتمل مظاہرین کا کہنا ہے کہ وہ گذشتہ پانچ برسوں سے دیہاڑی دار مزدور کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں جس سے اُن کی ضروریاتِ زندگی پوری نہیں ہو سکتیں۔ اس کے علاوہ، بہت سوں کی شکایت ہے کہ اُنہیں جون سے اگست کا معاوضہ تین ماہ کی تاخیر سے ملا ہے۔

یہ صورت حال ناقابلِ قبول ہے: ایچ آر سی پی کا پنجاب حکومت سے مطالبہ ہے کہ وہ معذوری کا شکار لوگوں (پی ایل ڈبلیو ڈیز) کے حقِ روزگار کا احترام کرے۔ ان کا معاوضہ کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہیے جس سے وہ زندہ رہ سکیں، خاص کر اِس قسم کے حالات میں جب تیزی سے بڑھتی ہوئی مہنگائی دیگر لوگوں کی نسبت اُنہیں زیادہ متاثر کر سکتی ہے۔

مظاہرین کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ اِس برس اپریل میں وزیرِ قانون، پارلیمانی امور و سماجی بہبود، پنجاب راجہ بشارت نے وزیرِ اعلیٰ کے ایماء پر وعدہ کیا تھا کہ حکومت انہیں مستقل ملازم کا درجہ دے گی مگر ایسا لگ رہا ہے کہ ابھی تک اس وعدے کی پاسداری نہیں کی گئی۔ ایچ آر سی پی نے حکومت پر زور دیا ہے کہ مظاہرین کے جائز مطالبات پورے کرنے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں۔ معذوری کے شکار افراد کے میثاق کا فریق ہونے کی وجہ سے حکومت کی قانونی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک بھر میں پی ایل ڈبلیو ڈیز کے تحفظات دور کرے۔

[پریس ریلیز۔لاہور۔15 اکتوبر 2019]

اساتذہ کے حقِ روزگار کا احترام ریاست کا بنیادی فریضہ ہے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے 23 اکتوبر کو ڈی چوک اسلام آباد میں اساتذہ کے پُرامن احتجاج کو منتشر کرنے کے لیے پولیس کی جانب سے طاقت کے استعمال کی شدید مذمت کی ہے۔ ایچ آر سی پی کی فیکٹ فائنڈنگ ٹیم کو بتایا گیا کہ پولیس کی بھاری نفری نے احتجاجی کیمپ پر دھاوا بولا اور عورتوں سمیت 200 سے زائد مظاہرین کو گرفتار کیا۔ ٹیم کو یہ بھی بتایا گیا کہ پولیس بعض عورتوں کے ہمراہ اُن کے بچوں کو بھی اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئی۔

مظاہرین جن میں سے زیادہ تر بیسک ایجوکیشن کمیونٹی سسٹم کے تحت دور دراز علاقوں کے اسکولوں میں پڑھا رہے ہیں، کا کہنا ہے کہ اُنہیں آٹھ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ دی جاتی ہے جس سے اُن کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ کئی اساتذہ کی تنخواہ میں گذشتہ دو برسوں سے کوئی اضافہ نہیں ہوا؛ اور اس سے بھی بڑی زیادتی یہ کہ انہیں گذشتہ دس ماہ سے تنخواہ نہیں ملی۔ ان کو مستقل ملازم کا درجہ نہیں دیا گیا جس کا مطلب ہے کہ انہیں ہر وقت روزگار کھونے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ جب 2018 میں اُنہوں نے دھرنا دیا تھا تو وفاقی وزیرِ تعلیم اور جوائنٹ سیکریٹری تعلیم نے اُنہیں یقین دہانی کروائی تھی کہ ایک برس کے اندر اُن کی ملازمت کو مستقل کر دیا جائے گا مگر یہ وعدا ایفا نہیں کیا گیا۔ ملک کے 137 اضلاع میں جاری اس منصوبے کے تحت سات لاکھ طالبعلم تعلیم حاصل کر رہے ہیں جبکہ 12,000 اساتذہ زیرِ ملازمت ہیں

ریاست نے اساتذہ کے احتجاج کے ردِعمل میں تشویشناک حد تک زیادہ طاقت استعمال کی ہے۔ مظاہرین کی شکایت ہے کہ پولیس نے عورتوں کو یہ کہہ کر کنٹینرز کے اندر بند کر دیا کہ وہ وہاں محفوظ رہیں گی اور اس دوران دیگر مظاہرین کو منتشر کرنے کے لیے واٹر کینن اور لاٹھیاں استعمال کرتی رہی۔ اگرچہ گرفتار شدہ لوگوں کی ضمانت منظور ہو گئی ہے مگر کئی مظاہرین کا کہنا ہے کہ اُن کا سامان پولیس نے ضبط کر لی تھیں اور ان کے پاس ضمانت کے لیے درکار پیسے نہیں ہیں۔ پولیس کا کہنا ہے کہ مظاہرین نے ریڈ زون میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے اُسے طاقت استعمال کرنا پڑی۔

ایچ آر سی پی کا حکومت سے مطالبہ ہے کہ عوام کے پُرامن اجتماع اور مناسب معاوضے کے حق کا احترام کیا جائے، اور انہیں مستقل روزگار کی فراہمی کے لیے فی الفور اقدامات کیے جائیں۔ ایک ایسی ریاست جو اساتذہ کے مہذب روزگار کے حق کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتی اپنے عوام کی مایوسی کا سبب بنتی ہے۔

[پریس ریلیز۔لاہور۔25 اکتوبر 2019]

سزائے موت کے خلاف عالمی دن

تربت ایچ آر سی پی اسپیشل ٹاسک فورس تربت کمران کے زیرِ اہتمام ''سزائے موت کی مخالفت کے عالمی دن'' کے موقعے پر 10 اکتوبر 2019 کو دو حصّوں پر مشتمل ایک پروگرام منعقد ہوا، پہلے حصے میں دفتر میں ایک اجلاس منعقد ہوا، جس میں 25 خواتین و حضرات نے شرکت کی۔ اور موضوع پر تقریریں اور کھلی بحث ہوئی۔ مقررین میں غنی پرواز، طاہر بلوچ، محمد جان دشتی، محمد کریم گچکی، حلیم بلوچ ایڈووکیٹ، اور شہناز شیر شامل تھے۔ جبکہ کھلی بحث میں بشیر کسانوی، شریف شمبئے زئی، گلزار دوست، ڈاکٹر سمّی پرواز، نائیلہ تاج، اور بعض دیگر بھی شامل تھے۔ جبکہ دوسرے حصّے میں دفتر کے سامنے موضوع سے مختلف نعروں سے مُزیّن پلے کارڈوں کے ساتھ لوگوں نے ایک مظاہرہ کیا۔ اور اس دوران اسد اللہ بلوچ نے پروگرام کی طرف سے کئی قراردادیں پیش کیں، جنہیں اتفاقِ رائے سے منظور کرلیا گیا۔

اجلاس کے شرکاء کا کہنا تھا کہ'' سزائے موت کی مخالفت کے عالمی دن'' کے انعقاد کا بنیادی مقصد دنیا کے ملکوں، قوموں اور لوگوں کو یہ شعور و آگہی فراہم کرنا ہے کہ انسان قابلِ احترام ہوتا ہے، جس کے کئی بنیادی انسانی حقوق ہوتے ہیں، جن میں حقِ زندگی، حقِ تعلیم، حقِ روزگار، حقِ صحت، حقِ خاندانی زندگی، حقِ نقل و حمل، حقِ رائے دہی، حقِ نمائندگی اور دیگر حقوق شامل ہیں۔ جن میں سے حقِ زندگی اُس کا سب سے بڑا بنیادی انسانی حق ہے، جسے اُس کی فطری عمر کی تکمیل سے پہلے اُس سے چھیننا نہیں چاہیئے۔ مزید یہ کہ انسان قابلِ اصلاح ہے۔ اور جرائم کے ارتکاب کے بعد، جب بھی اسے موقع ملے، وہ اپنی اصلاح کرسکتا ہے۔ مثلاً عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ تجربہ کار ہونے کی صورت میں، یا جیل میں ذہنی تربیت ملنے کی صورت میں یا پھر جیل میں کوئی ہُنر سیکھنے کی صورت میں، وہ اپنی اصلاح کرکے آئندہ جرائم سے بچ سکتا ہے۔ پھر یہ کہ تجربے میں آیا ہے کہ سزائے موت دینے سے جرائم کم نہیں ہوتے، بلکہ اُن میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس کی مثال اُن ممالک کے حالات کی ہے، جہاں ابھی تک سزائے موت برقرار ہے۔ شرکاء نے کہا کہ اس وقت اقوام متحدہ کے ممبر ممالک کی کل تعداد 193 ہے۔ جن میں سے 106 ممالک میں سزائے موت مکمل طور پر ختم ہوچکی ہے۔ جن میں برطانیہ سمیت یورپی یونین کے 28 ممالک، آسٹریلیا، کینیڈا، میکسیکو اور بعض دیگر ممالک شامل ہیں۔ 8 ممالک میں نسبتاً چھوٹے جرائم کے لئے جزوی طور پر ختم ہوچکی ہے، جن میں سرائیل، برازیل اور پیرو وغیرہ شامل ہیں۔ 23 ممالک میں قانونی طور پر تو سزائے موت برقرار ہے، مگر اس پر عمل نہیں کیا جاتا ہے، جن میں روس، الجزائر، کینیا، گھانا، مالدیپ، میانمار، زمبیا اور تاجکستان وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ 56 ممالک میں سزائے موت ابھی تک مکمل طور پر برقرار ہے۔ جن میں امریکہ، چین، ہندوستان، پاکستان، افغانستان، عراق، شام، ترکی، سعودی عرب اور کئی دیگر ممالک شامل ہیں۔

آج کے اس پروگرام کے ذریعے پُرزور مطالبہ کیا جاتا ہے کہ پاکستان سمیت دنیا کے تمام ممالک میں سزائے موت کو مکمل طور پر ختم کیا جائے۔ اور اگر کسی واقعے کے سلسلے میں ضروری ہو تو عمر قید دی جائے۔ مظاہرے میں درج ذیل قراردادیں منظور ہوئیں۔

(1) سزائے موت کو مکمل طور پر ختم کیا جائے

انسان قابلِ احترام ہے۔ اگر وہ غلطیاں کرتا ہے تو مُناسب مواقع ملنے پر اُن غلطیوں کو دور کرکے اپنی اصلاح بھی کرسکتا ہے۔ اور اُسے سزائے موت دینے سے جرائم کم نہیں ہوتے بلکہ اُن میں اضافہ بھی ہوسکتا ہے۔ ایسے حالات میں آج کے اس پروگرام کے ذریعے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ پاکستان سمیت دنیا کے جن ممالک میں سزائے موت ابھی تک برقرار ہے وہاں اُسے مکمل طور پر ختم کردیا جائے۔

(2) روزگار کے ذریعے بری سرگرمیوں اور جرائم پر قابو پایا جائے

دیکھنے میں آیا ہے کہ گزشتہ کچھ عرصے سے کیچ اور مکران سمیت بلوچستان بھر میں بھیک، چوریوں اور ڈاکوں میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکے کے حالیہ دو واقعات نے تو سارے بلوچستان کو حیرت زدہ کردیا۔ جن میں سے ایک واقعہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ کی طرف سے زور بازار تربت میں سیٹھ حامد کے گھر میں گُھس کر اور گھر کے جملہ خواتین و حضرات اور بچوں کو ایک کمرے میں بند کرکے، عورتوں کے کان کاٹ کر اُن سے تمام زیورات چھیننے اور پورے گھر کی تمام قیمتی اشیاء کا صفایا کرنے کا واقعہ ہے۔ جبکہ دوسرا، واقعہ ڈاکوؤں کے ایک اور گروہ کی طرف سے آبسر بلوچی بازار تربت میں واجہ موسیٰ کے گھر میں نقب زنی کرنے اور عورتوں، مردوں اور بچوں کو ایک کمرے میں بند کرنے کے بعد، عورتوں کے زیورات سمیت گھر کی تمام قیمتی چیزوں کا صفایا کرنے کا واقعہ ہے۔ ایسے گھناؤنے اور غیر انسانی واقعات کی سب سے بڑی وجہ بے روزگاری اور معاشی بد حالی ہے۔ کرپشن کی روک تھام اور فلاحی مملکت کے قیام کے کھوکھلے نعروں سے کچھ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی لوگوں کو بے روزگار کرکے اُن کے منہ کے نوالے چھیننے سے کچھ ہوسکتا ہے۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ عام لوگوں کو روزگار فراہم کرکے اُن کے معاشی حالات بہتر بنائے جائیں۔ لہٰذا اس پروگرام کے توسط سے پُرزور مطالبہ کیا جاتا ہے کہ روزگار کے ہتھیار کے ذریعے غلط سرگرمیوں اور روز بہ روز بڑھتے ہوئے جرائم پر قابو پایا جائے۔ اور اس مقصد کے لئے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ کیچ، اور مکران سمیت بلوچستان بھر کے بے روزگار لوگوں کو روزگار فراہم کیا جائے۔ اور جن لوگوں سے اُن کے روزگار چھین لیئے گئے ہیں اُنہیں اُن کے روزگار واپس کیئے جائیں۔ اور جن لوگوں کے روزگار کا بندوبست نہیں کیا جاسکتا، اُنہیں اُس وقت تک ماہانہ معقول بے روزگاری الاؤنس دیا جائے، جب تک کہ اُنہیں برسرِ روزگار نہیں کیا جاسکتا۔ (غنی پرواز)

پھانسی چڑھنے سے 24 گھنٹے پہلے

سزائے موت کے خلاف عالمی دن کے موقع پر اپنی نوعیت کی پہلی اور منفرد پرفارمنس منگل کی رات 12 بجے سے بغیر کسی وقفے کے جاری ہے۔ یہ 24 گھنٹے کی پرفارمنس ذوالفقار علی خان کے بارے میں ہے جو سزائے موت کے قیدی تھے اور جنھیں 6 مئی 2015 کی صبح لاہور کی کوٹ لکھپت جیل میں پھانسی دی گئی تھی۔ ذوالفقار علی نے اپنی پھانسی سے قبل کہا' لکھے گئے تقدیر کے فیصلے کی سزا 19 سال کے طویل عرصے کے بعد پوری ہوئی۔' ذوالفقار علی خان کو ان کے جیل کے ساتھی قیدی اور عملہ احتراماً ڈاکٹر ذوالفقار کہتے تھے۔ ان کے پاس علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے حاصل کردہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی تھی جو انھوں نے قید کے دوران حاصل کی۔ انہوں نے نہ صرف اپنی تعلیم مکمل کی بلکہ جیل میں قید درجنوں قیدیوں کو تعلیم دی اور اپریل سنہ 2009 کے آخر تک ان کے 12 قیدی شاگردوں نے بی اے، 23 نے انٹر اور 18 نے میٹرک کے امتحانات پاس کیے۔ ذوالفقار علی خان کا ایک خط جو ان کے وکلا نے بی بی سی کو دیا اس میں انھوں نے اپنے جیل کے ایام کے بارے میں تفصیل لکھی، اپنے خدشات، اپنی لاوارث بچیوں کے مستقبل اور ان کی تعلیم کے حوالے سے پریشانیوں کا ذکر کیا۔ بی بی سی کو اُن قیدیوں کے خطوط بھی پہنچے جنھوں نے ذوالفقار علی خان کے جیل میں مثالی کردار کے بارے میں لکھا۔ ذوالفقار علی خان کے کردار کو نامور ہدایت کار اور اداکار سرمد کھوسٹ ادا کررہے ہیں جن سے ہمارے نمائندے موسیٰ یاوری نے بات کی اور ان سے اس پرفارمنس کا مقصد پوچھا۔ سرمد نے بات کرتے ہوئے بتایا کہ 'اس میں ایک چیلنج تھا، میں نے پہلے کبھی ایسی پرفارمنس نہیں کی، اس طرز کی پرفارمنس نہیں ہوئی۔ سو وہ تو تھا لیکن اس طرح کی چیز کو آپ 24 گھنٹے کا سکرپٹ نہیں دے سکتے۔ اس کا کوئی ڈائیلاگ ہے یا ایکشن ہے اس کو آپ نہیں کرسکتے جب تک آپ اس کو مہینوں میں توڑ توڑ کر اور حصوں میں شوٹ کریں۔ لیکن یہ براہ راست ہے تو یہ ایسے ہی ہوگا جیسے ایک دن زندگی کا ہوتا ہے۔ تو ادھر تک پہنچنے کے لیے ہم کچھ ایسی چیزیں کررہے ہیں، تھیٹر میں ریہرسل بہت ضروری ہوتی ہے اس لیے ہم ریہرسل کافی عرصے سے کررہے ہیں۔' اس سارے پروگرام کے لیے کام کرنے والی تنظیم جسٹس پراجیکٹ پاکستان کی رمل محی الدین نے بتایا کہ 'کافی چیزیں جو لوگوں کو معلوم نہیں کہ جب کسی کو پھانسی دیتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔ مطلب کہ جو سزائے موت کا قیدی ہوتا ہے اس کو جب تین دن تک قید تنہائی میں رکھا جاتا ہے۔ ان کو صرف چائے یا دودھ یا بسکٹ میں بسکٹ ملتے ہیں۔ ان کو کوئی کھانا نہیں ملتا کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ آپ بیمار ہوں۔ یہ چیز کافی پریشان کن ہے کہ ہم ایک بندے کو کہتے ہیں کہ وہ مرنے کے لیے بالکل صحت مند ہو۔ کہ جب ایک بندہ بالکل صحت مند ہو، قابل ہو، کام کرسکتا ہو، اپنی پوری زندگی جی سکتا ہے۔ تب ہی آپ اس کو پھانسی دیں گے ورنہ اگر وہ بیمار انسان ہے تو اس کو پھانسی نہیں دے سکتے۔' (بشکریہ بی بی سی)

بلوچستان میں کوئٹہ کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے مسائل

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق بلوچستان چیپٹر کے ایک وفد نے کوئٹہ کے قریب ڈیگاری، سنجدی اور سورینج میں کوئلے کی کانوں کا دورہ کیا اور وہاں پر کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور کان مالکان اور حکومتی عہداروں سے ملاقاتیں کیں۔ وفد نے ڈیگاری میں اس جگہ کا بھی معائنہ کیا جہاں کچھ پہلے ایک حادثہ پیش آیا تھا جس میں 11 مزدور ہلاک ہوئے تھے۔ وفد نے بلوچستان میں کوئلے کی کانوں میں بڑھتے ہوئے حادثات اور مزدوروں کے مسائل سے متعلق معلومات حاصل کیں۔

بلوچستان میں تقریبا ڈیڑھ لاکھ افراد کان کنی کے شعبے سے وابستہ ہیں جن میں تقریبا ایک لاکھ کان کن شامل ہیں جو کہ کانوں کے اندر کام کرتے ہیں، باقی کوئلہ کوٹرکوں اور گاڑیوں میں لوڈ کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے، ایک اندازے کے مطابق بلوچستان میں سالانہ 200 کے قریب کان کن مختلف حادثات میں ہلاک ہوتے ہیں۔ ان حادثات میں زیادہ تر وہ لوگ جان بحق ہوتے ہیں جو کانوں کے اندر کام کرتے ہیں کیونکہ ان کے لیے کوئی حفاظتی اقدامات نہیں کیے جاتے۔ ان میں اکثر حادثات کانوں میں گیس بھر جانے سے یا کان میں مٹی کا تودہ گرنے کے باعث رونما ہوتے ہیں جس سے اکثر ہلاکتیں ہوتی ہیں۔ وہاں کے لوگوں نے کانوں میں حادثات کی بنیادی وجہ ٹھیکیداری نظام اور ناقص حفاظتی انتظامات کو قرار دیا کیونکہ نجی کمپنیوں کے پاس اوزار نہ ہونے کے برابر ہیں جس کی وجہ سے مزدوروں کو محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہیں اور ہر وقت ان کے جانوں کو خطرات بھی لاحق ہوتے ہیں۔ حفاظتی انتظامات نہ ہونے کی وجہ سے حادثات اب ان کانوں کا معمول بن چکے ہیں۔ کانوں کے مالکان ہوں یا ٹھیکیدار وہ حفاظتی انتظامات یا مزدوروں کے حقوق کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ مزدوروں کو بہتر معاوضے نہیں دیئے جاتے۔ اور نہ ہی ان کو سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس جدید دور میں بھی کان کن روایتی طریقوں سے بیلچہ اور گینتی سے کوئلہ نکالتے ہیں جس کی وجہ سے کانوں میں گیس بھرنے سے حادثات رونما ہوتے ہیں۔ مزدور ہزاروں فٹ نیچے جا کر کان میں کھدائی کرتے ہیں اور ایمرجینسی کی صورت میں ان کو نکالنے کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا۔ اکثر حادثات کان کی زیادہ گہرائی میں ہونے کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔ اکثر کوئلے کی کانوں میں ہوا کے اخراج کا مناسب انتظام نہیں کیا جاتا جس سے کانوں میں زہریلی گیس جمع ہو جاتی ہے جو دھماکے کا سبب بنتی ہے۔ کانوں میں گیس کی موجودگی کا پتہ لگانے کے لیے آلات موجود نہیں ہوتے۔ مائینز انسپکٹر بھی بمشکل مہینہ میں صرف ایک دفعہ علاقے کا دورہ کرتا ہے۔ کان میں جانے سے پہلے مزدوروں کی حاضری کا بھی کوئی نظام موجود نہیں جس سے پتہ چل سکے کہ کان میں کتنے مزدور کام کر رہے ہیں۔ اگر کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کان میں کتنے لوگ پھنسے ہوئے ہیں۔ جب ان کو نکالا جاتا ہے تو ان کی تعداد اندازے سے زیادہ ہوتی ہے۔ موقع پر کان کنوں کے پاس ایسا کوئی مناسب بندوبست نہیں ہوتا تا کہ وہ کان میں پھنسے ہوئے مزدوروں کو ایمرجینسی میں مدد فراہم کر سکیں۔

جب تک امداد کے لیے سامان کا بندوبست کیا جاتا ہے اس وقت تک کان کن ہلاک ہو چکے ہوتے ہیں۔ کیونکہ کان میں ان کے لیے آکسیجن کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ ایک آکسیجن مہیا کرنے والے آلہ کی قیمت 7 سے 8 لاکھ روپے ہے جو اکثر ٹھیکیدار نہیں خریدتے۔ کان کنی کے علاقوں میں صحت کے حوالے سے بھی کوئی خاص بندوبست نہیں ہیں۔ ان کے لیے دوائی کی بھی سہولت میسر نہیں۔ علاقے میں ایک سرکاری ڈسپنسری تھی مگر اس میں بھی ادویات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اکثر مزدور ٹی بی اور جلد کی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ ان کے علاج کا کوئی مناسب بندوبست نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جب کوئی حادثہ ہوتا ہے تو کوئی میڈیکل ٹیم وہاں پر موجود نہیں ہوتی۔ حادثے میں ہلاک یا زخمی مزدوروں کے معاوضے کا بھی کوئی فوری بندوبست نہی ہے۔ ان کو ڈیتھ گرانٹ بھی سال کے بعد ملتی ہے۔ پہلے یہ گرانٹ تین لاکھ تھی جسے اب 5 لاکھ کر دیا گیا ہے۔ بہت سے مزدور شناختی کارڈ نہ ہونے کی وجہ سے ای او بی آئی میں رجسٹرڈ نہیں ہیں۔ اکثر مزدور افغان شہری ہیں کیونکہ ان کو مزدوری بھی کم دی جاتی ہے اور وہ رجسٹرڈ بھی نہیں ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ٹھیکیدار بھی افغانیوں کو کان میں مزدوری کے لیے لاتے ہیں۔

حالیہ واقعہ ڈیگاری پی ایم ڈی سی کوئٹہ میں پیش آیا۔ اس واقعے میں 10 مزدور ہلاک اور ایک زخمی ہوا تھا۔ یہ تمام افراد افغان تھے اس لیے ان کو کوئی ڈیتھ گرانٹ نہیں دی گئی بلکہ ان کے لاشوں کو نکالنے کے بعد فورا افغانستان منتقل کر دیا گیا۔ جس کان میں حادثہ ہوا وہ حکومت کی زیر ملکیت ہے جسے حکومت نے لیز پر ایک پرائیویٹ کمپنی کو دیا ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں پر کوئی سرکاری سرپرستی نہیں تھی۔ کمپنی کے ساتھ صرف ایک معاہدہ کیا گیا ہے کہ وہ سالانہ حکومت کو اتنے پیسے ادا کرے گی۔ حادثہ بجلی کی کیبل کی وجہ سے پیش آیا تھا کیونکہ وہ کیبل تقریبا 1950 سے لگی ہوئی تھیں اور کان سے نکلنے کا کوئی متبادل راستہ نہیں تھا۔ اس وجہ سے کان میں گیس بھر جانے کی وجہ سے ہلاکتیں ہوئیں۔

سفارشات

1۔ کوئلے کی کانوں میں مزدوروں کے اندراج کا طریقہ کار وضع کیا جائے اور زیر زمین کان کنی کے لیے جاتے وقت ان کی حاضری کو یقینی بنایا جائے۔

2۔ مائننگ انجینئرز کی بھرتی کو فوری طور پر عمل میں لایا جائے اور حکومت پاکستان کان کنی سے متعلق موجودہ پالیسوں پر مزید سخت اور مکمل عملدرآمد کو یقینی بنائے۔

3۔ تمام کانوں میں مناسب ہوا کا بندوست کیا جائے اور کانوں میں ہنگامی اخراج کے لیے متبادل راستے بنائے جائیں۔ کانوں میں آکسیجن کا بندوبست ہونا چاہیئے۔

4۔ مائننگ کے شعبے کو جدید خطوط پر استوار کر کے سہولیات فراہم کیا جائے۔

5۔ کوئلے کی کانوں میں گیس بھرنے سے حادثات رونما ہوتے ہیں۔ چنانچہ، کانوں جدید گیس ڈیڈیکٹر مہیا کیے جائیں۔

6۔ پی ڈی ایم اے اور دیگر امدادی ٹیموں کو کان کنی کے علاقوں موجود ہونا چاہیئے۔

7۔ آکسیجن گیس مہیا کرنے والے آلات ہر کان کن کے پاس موجود ہونے چاہئیں تا کہ حادثے کی صورت میں وہ اس کو استعمال کر سکیں۔

8۔ مزدوروں کو حادثے کے فورا بعد معاوضہ دیا جائے اور ساتھ ان کے بچوں کی کفالت کے لیے خصوصی فنڈز مختص کیے جائیں۔

9۔ ٹھیکیدار کو کان کنی کے قوانین کا پابند بنایا جائے اور جب اس کے ساتھ معاہدہ کرتے وقت اس کو اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ تمام حفاظتی سامان مہیا کرے گا۔ جب کوئی حادثہ ہو تو اس کی مکمل چھان بین کی جائے اور اگر اس میں ٹھیکیدار کی غفلت پائی جائے تو اس کا لائسنس بھاری جرمانے کے ساتھ منسوخ کیا جائے۔

10۔ 1823 کے ایکٹ کو ختم کر کے نیا ایکٹ متعارف کرایا جائے جس میں مزدوروں کے حقوق کا خاص خیال رکھا جائے۔

11۔ مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کا خاص بندوبست کیا جائے۔

12۔ مزدوروں کے لیے ہسپتال کا انتظام کیا جائے جہاں ان کا مہینہ میں ایک چیک اپ ضروری ہو تا کہ اس کو ٹی بی اور جلد کی بیماریوں سے بچایا جا سکے۔

13۔ کان کنی کے مقامات پر معیاری سڑکیں تعمیر کی جائیں تا کہ ہنگامی صورتحال میں وہ آسانی سے ہسپتال پہنچ سکیں۔

14۔ حکومتی حفاظتی تربیت کے دنوں میں مزدوروں کو سرکاری حفاظتی امور سے لے کر کانوں سے متعلق تربیت دی جائے اور مزدوروں کو تنخواہ یومیہ مہیا کی جائے۔

15۔ حکومت پاکستان کو مائن کنونشن 1995 میں آئی ایل او کی حفاظت اور صحت سے متعلق دفعات شامل کرنی چاہئیں اور زیر زمین کوئلے کی کانوں میں 2006 کے کوڈ سیفٹی اینڈ ہیلتھ پر بھی عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

وفد میں فرید احمد سید احد آغا، شمس الملک مندوخیل اور عبداللہ بلوچ شامل تھے۔

(فرید احمد)

ایک عوامی مکالمہ

آئی۔اے۔رحمان

گذشتہ ہفتے اور اتوار کو ہونے والی دو روزہ عاصمہ جہانگیر کانفرنس خاموشی سے ایک عوامی اجتماع میں بدل گئی۔ درجنوں مقررین میں سے ہر ایک نے عاصمہ جہانگیر کو خراج پیش کیا اور پھر سامعین کو بتانا شروع کر دیا کہ پاکستان کا اصل مسئلہ کیا ہے، اس کا ذمہ دار کون ہے اور اسے حل کیسے کیا جا سکتا ہے۔

کانفرنس کی نشستوں کے دوران کوشش کی گئی کہ چیزوں کو ان کی اصلی ہیئت میں دیکھا جائے اور ذاتی / گروہی شکایات کے اظہار سے گریز کیا جائے۔ تقریب کے آخری سیشن میں یہ سعی آپ کو نظر آئے گی۔ پی ٹی آئی کی نمائندہ منزہ حسن سے یہ سن کر بڑا اچھا لگا کہ عورتوں کی خودمختاری اُن کی سیاسی ترجیح ہے۔ مریم اورنگ زیب نے دوسرے میثاقِ جمہوریت کا مطالبہ کیا، بے نظیر بھٹو کی جدوجہد کو سراہا اور نواز شریف کی آزمائش کا سرسری ذکر کیا۔ یوسف رضا گیلانی نے بطورِ وزیراعظم اپنے اقدامات کو یاد کیا اور افسوس کا اظہار کیا کہ موجودہ حکومت اختلاف کو دبانے کے لیے بُرے قوانین کا سہارا لے رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آصف علی زرداری نے پارلیمان کی مضبوطی کے لیے صدر کے بعض اختیارات ختم کر دیے تھے جبکہ ان کے خلاف مقدمات کا ذکر کرنے سے گریز کیا۔

مرکزی جماعتوں کے رہنماؤں نے ثابت کیا کہ سیاستدانوں میں تنقید برداشت کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ خاموش بیٹھے رہے جب منیزے جہانگیر نے کہا کہ سیاستدان انسانی حقوق کو بھول جاتے ہیں جب وہ سیاست میں ہوتے ہیں اور انہیں انسانی حقوق صرف اس وقت یاد آتے ہیں جب وہ اقتدار میں نہیں ہوتے۔ وہ اسی طرح بالکل خاموش رہے جب انہیں یاد دلایا گیا کہ ان کے پیروں کی زنجیریں ان کی اپنی بنائی ہوئی ہیں۔

کانفرنس نے اس حقیقت پر مہر ثبت کی کہ سیاستدانوں، مختلف شعبوں کے ماہرین، سماجی کارکن اور انسانی حقوق کے دفاع کاروں کی اچھی خاصی تعداد اپنے احساسات کے اظہار کے لیے ایک فورم ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ عاصمہ جہانگیر فاؤنڈیشن، اے جی ایچ ایس اور پاکستان بار کونسل کے پیش کردہ پلیٹ فارم پر جست لگا کر چڑھ گئے کیونکہ اس نے ان کی توقعات پر پورا اترنے کا عہد کیا تھا۔ مزید یہ کہ، انہوں نے اُس خوف سے پاک ماحول پایا جس نے ان سے بولنے کی استعداد چھین لی تھی اور انہیں احتجاج کیے بغیر ہر طرح کی ذلتیں اور جبر برداشت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور کانفرنس کا ایجنڈا اتنا وسیع تھا کہ اُن مختلف امور پر آراء کا تبادلہ ممکن تھا جو عوام کی بقاء پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور آنے والی نسلوں کی زندگی کے لیے خطرے کا موجب ہیں۔

اعلیٰ عدالتوں کے معزز جج صاحبان، برطانیہ اور آئرلینڈ کے ججوں اور وکیلوں اور سفارتی صفوں کے نمائندگان۔۔۔ نیدرلینڈز نے خاص طور پر اپنے انسانی حقوق کے سفیر بھیجے تھے۔۔۔ نے کانفرنس کو ایک پُرجوش آغاز دیا جس کے بعد ذرائع ابلاغ کی نمایاں شخصیات نے ملک بھر میں رائج سنسرشپ کے ذریعے راج کرنے کی پالیسی کی مذمت کرنے

> پی ٹی آئی کی نمائندہ منزہ حسن سے یہ سن کر بڑا اچھا لگا کہ عورتوں کی خودمختاری اُن کی سیاسی ترجیح ہے۔

میں کوئی لمحہ ضائع نہ کیا۔ صحافیوں کے تحفظ کی کمیٹی کے نمائندے سٹیو بٹلر کو ملک میں داخلے کی اجازت سے انکار کے حکومتی فیصلے نے ان کے غصے کو اور ہوا دی۔

لوگوں کے بڑے مجمع نے جنوبی ایشیائی ریاستوں کی چھوٹی سوچ جوان کا طرّہ امتیاز ہے، پر بھی غصے کا اظہار کیا جب انہیں معلوم ہوا کہ بھارتی سول سوسائٹی کے ممتاز رہنماؤں سیدہ حمید اور تپن بوس کو ویزا نہیں دیا گیا۔ سامعین کو جب پتہ چلا کہ غیر ملکیوں کو پاکستان میں داخل ہونے سے روکنے والی بلیک لسٹ میں ہزاروں افراد کا نام ہے تو وہ اور ز؟ادہ خفا ہوئے۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ اس لسٹ کو اتنی ہی من مرضی سے نہیں بنایا گیا جتنی من مرض؟ سے ایگزٹ کنٹرول لسٹ تیار کی گئی ہے۔ اور بٹلر تو پاکستانی سفارت خانے کے جاری کردہ قانونی ویزے کے ساتھ پاکستان آئے تھے۔ حکومت کو وہ تمام دستاویزات دی گئی تھیں جس کا اس نے تقاضا کیا تھا۔

قانون کی حکمرانی کے سیشن میں جسٹس فائز عیسیٰ نے اپنے خطاب میں دستور اور دستور پسندی کے احترام کی ضرورت پر زور دیا، اور اُن کے خطاب کے بعد پاکستان میں قانون کی حکمرانی کی فرضی داستان پر کُھل کر بات ہوئی۔

بلوچستان نیشنل پارٹی (مینگل)، عوامی نیشنل پارٹی، پی پی پی اور پاکستان عوامی پارٹی کے رہنماؤں نے اپنے حقوق کی خلاف ورزیوں پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ انہیں آئین کے احترام اور اٹھارہویں ترمیم کے نفاذ کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے۔ سامعین میں سے کئی نے ایسی داستانیں پہلے نہیں سنی تھیں جو پسے ہوئے طبقوں کے نمائندوں نے بیان کیں۔

فاٹا اور کے پی میں اُس کے انضمام پر ہونے والے سیشن میں قبائلی علاقوں میں سویلین حکمرانی کے مطالبے کی بازگشت سنائی دی گئی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ قبائلی علاقوں کے عوام کو وہی حقوق دینے کی بجائے جو کے پی کی عوام کو حاصل ہیں، کے پی کو بھی پسماندہ قبائلی معاشرے میں تبدیل کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

ایک دوسرے سیشن میں عدم مساوات کی لعنت کا مفصّل احاطہ کیا گیا اور غیر معمولی ٹیکس چھوٹوں سے ہونے والے نقصانات سے پردہ اٹھایا گیا۔ ماہرین معیشت سارے سچ سے پردہ اٹھانے سے خوفزدہ تھے۔ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ عدم مساوات نظام کے ڈھانچے کی پیداوار تھی اور ریاست کو عوام کے حقوق کے تحفظ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ واحد حل نئی ریاست کا قیام تھا (اس مفروضے کے ساتھ کہ ریاست برطانیہ کے جانیکے بعد ریاست بنائی گئی)۔

ہندوستان کے زیرِ انتظام کشمیر کے بحران کو خاص توجہ ملی اور عورتوں کے حقوق کی جدوجہد اور شعبہ قانون اور میں ان کے کردار، بچوں کے حقوق، اور سول سوسائٹی کے لیے گھٹن کی بڑھتی ہوئی فضا پر بھی سیر حاصل گفتگو ہوئی۔

یہ مشاہدہ کیا گیا کہ جمہوریت اور ساسی آزادیوں کی نشستوں میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی اور نوجوان مرد اور عورتیں عمر رسیدہ افراد سے ز؟ادہ نظر آئیں۔ غالباً، شرکا میں سب سے زیادہ پُرجوش طالبعلم تھے جو بہت بڑی تعداد میں شریک تھے۔

اگرچہ جو کچھ کہا گیا وہ بہت اہم تھا، تقاریر اور گفتگوؤں کا لہجہ بھی اتنا ہی اہم تھا۔ اختلاف رائے کرنے والوں پر جارحانہ کلمات اور سخت حملوں کا نہایت شائستگی کے ساتھ جواب دیا گیا۔

سامعین کے لیے عاصمہ جہانگیر کانفرنس کا شاید سب سے اہم پیغام یہ تھا کہ ریاست کو اپنے بحرانوں پر قابو پانے اور آگے کی طرف پیش قدمی کے لیے شہریوں کے ساتھ ایک مہذب مکالمہ کرنا ہوگا۔ ایسا کوئی بھی معاملہ نہیں جو اچھی بات چیت سے حل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ایسا کوئی مسئلہ ہے جسے لوگ اپنی دانش سے حل نہیں کر سکتے۔ کوئی بھی اقدام لوگوں کو اس قابل نہیں بنا سکتا کہ وہ صاحبانِ اقتدار کی جی حضوری کے کلچر سے جان چھڑا سکیں، تاہم اگر عوام کو ان کے فطری وقار اور فطری حقوق سے روشناس کرنے کی کوشش جاری رہے تو پھر انہیں اپنا مقدر اپنے ہاتھوں میں لینے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان)

مُسلم ذہن کا جمود: اپنے علمی وفکری بحران پر ایک نظر

حارث خلیق

میرا نقطہ نظر بنیادی طور پر اس تخلیقی مصنف کا ہے جس کی دلچسپیوں کا مرکز ثقافت، معاشرہ، تاریخ اور سیاست ہے۔ میں مانتا ہوں کہ علم وفکر کے موضوعات پر بحث کرنا ماہرینِ تعلیم، علماء اور دانشوروں کا وصف ہے لیکن معاشرے کے ایک فکرمند رکن کی حیثیت سے اپنے سماجی حالات اور بحران پر تبصرہ کرنا میری ذمہ داری ہے۔

اس بحث کے موضوع کے لیے 'جنوبی ایشیاء کے مسلمان' ایک مناسب اصطلاح ہے بجائے اس کے کہ انہیں پاکستانی، بھارتی اور بنگلا دیشی معاشروں میں تقسیم کیا جائے یا انہیں مزید کیرالائی، کشمیری، پختون اور پنجابی وغیرہ، نیز بیرونِ ملک مقیم جنوبی ایشیائی مسلمانوں تک محدود کیا جائے۔

اِس کے باوجود، کچھ ایسے فرق ہیں جنہیں تسلیم کرنا چاہئے۔ اگرچہ بنیادی طور پر مسلم اکثریتی سماج پاکستانی اور بنگلا دیشی معاشرے ہی ہیں مگر بھارت کے اندر بھی ایک بہت بڑی مسلم آبادی موجود ہے جو فطری طور پر موجودہ ہندوستانی معاشرے اور ثقافت سے تعلق رکھتی ہے مگر کئی لحاظ سے اُس سے مختلف بھی ہے۔ اگر آبادی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بنگلا دیشی اور پاکستانی معاشروں جتنی وسیع ہے۔ اِس کے علاوہ، سیاست، دینیات اور سماجی علوم سے متعلقہ مختلف مکتبہ ہائے فکر، اور نمایاں تعلیمی ادارے جنہوں نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مختلف اقسام کے جنوبی ایشیائی دینی نقطہ ہائے نظر ترتیب دیے، تقریباً تمام ہی اس خطے میں واقع تھے جو آج بھارت کہلاتا ہے۔

1947ء میں برطانوی ہندوستان کی دو ملکوں میں تقسیم، اور پھر 1971ء میں پاکستان کی دو الگ ریاستوں میں تقسیم کے بعد سے، اپنی ریاستوں اور شہریت کے لحاظ سے ہم مختلف لوگ ہیں۔ اس کے علاوہ، ہماری کئی زبانیں اور ثقافتیں، یا کچھ صورتوں میں، ذیلی ثقافتیں ہیں۔ لیکن اگر ہمیں جنوبی ایشیاء کے مسلمان کے طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہماری عِلمیت کی روایت ایک دوسرے سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے۔ ہماری تہذیب، ثقافت، اجتماعی نفسیات اور سمجھ بوجھ کی صلاحیت ایک جیسی ہے۔ پھر اس کے اندر افکار وآراء، اطاعت ومزاحمت، فوقیت و ترجیح اور اقدار وعمل کی کئی پرتیں ہیں۔ لہذا، جنوبی ایشیاء کے تمام مسلم معاشروں میں عِلمیت کے ایک جیسے بحران کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

ایسے دانشور اور ماہرینِ تعلیم موجود ہیں جو اپنے متعلقہ شعبوں میں نام کمارہے ہیں۔ لیکن، تقریباً 60 کروڑ لوگوں کی آبادی جو ہمارا موضوع بحث ہے کو مدنظر رکھیں تو پھر ان کی تعداد نہ صرف غیر معمولی طور پر کم ہے بلکہ علم اور تحقیق کے بعض نمایاں شعبوں میں ماہرین کی موجودگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ حتیٰ کہ بھارت میں دانشوروں کے بڑھتے ہوئے حلقے میں بھی مسلمان دانشوروں کی تعداد بہت کم ہے۔

اب ہم فلسفے اور مذہب، طبیعی وحیاتیاتی علوم، سماجی علوم اور علم الانسان کی صورتحال پر نظر ڈالتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ بحران کیوں ہے اور اگر اس پر قابو پایا جانا ممکن ہے تو پھر کیسے قابو پایا جائے؟

مَیں فلسفے اور مذہب کے دو مختلف موضوعات کو ایک ساتھ دیکھتا ہوں کیونکہ جنوبی ایشیاء کے مسلمان، انہیں صحیح یا غلط طور پر، ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال 'منطق' ہے جو بطورِ مضمون ہمارے مدارس میں پڑھائی جارہی ہے۔ فلسفے کا بیج مغرب میں بویا گیا تھا۔ ہمارے ہاں یہ دیر سے آیا۔ یونانیوں سے لے کر فرانسیسیوں اور جرمنوں سے لے کر اینگلو سیکسن روایت تک، فلسفیانہ تحقیق مغرب میں پروان چڑھی۔ عربوں نے قرونِ وسطیٰ میں قدیم یونانیوں اور دورِ جدید کی یورپی روایت کے درمیان اُس خلا کو پُر کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا جو یورپ میں مسیحیت نے پیدا کیا تھا۔

جنوبی ایشیا میں قبل از مسیح اور بعد از مسیح ادوار میں عمومی جھکاؤ فلسفے کے بجائے انسانی حالت، اخلاقیات، ریاضی اور ادب کی جانب رہا جنہیں علم کے طور پر لیا جاتا رہا۔ لیکن چونکہ ایک عالمگیر انسانی تہذیب نے جنم لے لیا ہے جو ہمارے اجتماعی علم، تجربے اور حکمت کا احاطہ کرتی ہے چنانچہ اب ہم سمیت دنیا بھر کی بیشتر علمی اور عقلی ثقافتوں نے فلسفے کے مضمون کو بطورِ ایک الگ علم مکمل طور پر اپنا لیا ہے۔ لیکن ہم جدید وقتوں میں ایک بھی ایسا فلسفی پیدا نہیں کر سکے جس کے افکار نے کسی خاص موضوع یا عمومی طور پر دنیا کو بہتر یا مختلف طور پر سمجھنے میں ہماری مدد کی ہو۔ ہمارے ہاں زیادہ سے زیادہ چند اچھے شارح اور تبصرہ نگار پیدا ہوئے ہیں۔

> مَیں فلسفے اور مذہب کے دو مختلف موضوعات کو ایک ساتھ دیکھتا ہوں کیونکہ جنوبی ایشیاء کے مسلمان، انہیں صحیح یا غلط طور پر، ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال 'منطق' ہے جو بطورِ مضمون ہمارے مدارس میں پڑھائی جارہی ہے۔ فلسفے کا بیج مغرب میں بویا گیا تھا۔ ہمارے ہاں یہ دیر سے آیا۔ یونانیوں سے لے کر فرانسیسیوں اور جرمنوں سے لے کر اینگلو سیکسن روایت تک، فلسفیانہ تحقیق مغرب میں پروان چڑھی۔ عربوں نے قرونِ وسطیٰ میں قدیم یونانیوں اور دورِ جدید کی یورپی روایت کے درمیان اُس خلا کو پُر کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا جو یورپ میں مسیحیت نے پیدا کیا تھا۔

فلسفہ اور مذہب کے درمیان تناؤ کی کیفیت بھی رہی ہے جس کا مظہر مذہبی علماء کی تحریریں ہیں۔ شاید ایسا ہی تناؤ نشاطِ ثانیہ سے پہلے مسیحیت اور فلسفے کے درمیان تھا۔ تاہم چند ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے مذہبی نظریات کی تعریف اور وضاحت کے لیے فلسفیانہ تحقیق کو ایک آلے کے طور پر استعمال کیا، جو مَیں کہوں گا کہ عقیدے کو منطق کے عین مطابق قرار دینے کی ایک کوشش تھی۔ یہ فلسفہ نہیں ہے۔ لیکن مذہبی علمیت اور دینیات کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی یہ بات قابلِ غور ہے کہ آخری معتبر دانشور بھی جنہوں نے حقیقی کام تخلیق کیا، سب 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ بیسویں صدی کا اوائل اور وسط وہ دور تھا جب مسلمانوں میں گروہی شناخت اور احیائے دین کا احساس بڑھ رہا تھا۔ لیکن چاہے ان کے خیالات بنیاد پرست ہی کیوں نہ ہوں، وہ مختلف نقطہ ہائے نظر کے حوالے سے رواداری کا مظاہرہ ضرور کرتے تھے۔

گزشتہ پچاس سالوں کے دوران مجھے کوئی ایسا معنی خیز کام دکھا دیں جس نے مسلم معاشروں کے نظم ونسق یا نظام کو نظریاتی طور پر متاثر کیا ہو۔ درحقیقت، یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ اُن معاشروں میں بامعنی مذہبی علمیت مفقود ہوتی ہے جہاں سماجی سرگرمیوں سے لے کر تجارتی سرگرمیوں تک ہر چیز کے لیے مذہبی منظوری درکار ہو۔ علمیت اور دینیات کے میدان میں جنوبی ایشیاء کے مسلمان ندوۃ الاسلام اور دارالعلوم دیوبند یا بیسویں صدی کے وَسط میں جماعت اسلامی کے مکتبہ فکر سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ اُس دور میں ہم نے برطانوی تعلیم حاصل کرنے والی پَود میں بھی قاضی سلیمان سلمان منصور پوری سے لے کر جسٹس سید امیر علی جیسے لوگ پیدا کیے۔

بہت سوں کا ماننا ہے کہ ہمارے موجودہ مبلغین درحقیقت علماء ہیں۔ اِس مغالطے نے ہمیں ایک ایسی صورتحال سے دوچار کردیا ہے جہاں یہ مسئلہ محض نظریاتی اور سیاسی نہیں رہا بلکہ اس میں لاعلمی اور بے عقلی بھی شامل ہوگئی ہے۔ کچھ لوگ اس سے مستثنا ہو سکتے ہیں جیسے کہ مولانا وحیدالدین خان اور جاوید احمد غامدی یا مرحوم اصغر علی انجینئر اور مرحوم ڈاکٹر فاروق خان۔ ذرا ہمارے علماء کہلانے والے مبلغین میں سے کسی ایک کے ساتھ مذہب پر ایک سنجیدہ علمی مباحثے کا تصور کیجیے۔ اور پھر چالیس سال پہلے تفہیم الاقرآن اور خلافت وملوکیت کے مصنف مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ ایسے ہی مکالمے کے امکان کو یاد کیجیے۔ اِس حوالے سے جو زوال آیا ہے وہ ڈرا دینے والا ہے۔

اب ہم طبیعی وحیاتیاتی علوم کی طرف آتے ہیں۔ طبعیات، کیمیا، حیاتیات جیسے علوم اور ان کی بعدازاں وجود میں آنے والی سینکڑوں شاخوں میں جنوبی ایشیا کی مسلم آبادی کا کوئی نمایاں کردار نہیں رہا۔ مگر ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے دور کے دوردراز کے عرب اور قریب المشرق کے سائنسدان علوم میں ہمارے پیش رو ہیں۔ تاہم، نوآبادیاتی دور میں سرسید احمد خان اور ان کے ساتھیوں کے تصورات اور کاوشوں کی بدولت کچھ روشن امکانات پیدا ہوئے تھے۔

مسلم اشرافیہ میں سرسید شاید پہلے شخص تھے جنہوں نے محسوس کیا کہ مسلمان طالب علموں کو مختلف علوم پڑھانا بہت ضروری ہے۔ انہوں نے مجموعی طور پر جدید اور فکری تعلیم کی ضرورت پر بھی زور دیا جس پر اُنہیں استعماریت کا طفیلی کہا گیا۔ انہوں نے 1862ء میں ایک مترجم سوسائٹی (Translation Society) کی بنیاد رکھی جو 1864ء میں علی گڑھ سائنسی سوسائٹی (Scientific Society of Aligarh) میں تبدیل ہوگئی۔ اس اقدام کا مقصد مغربی ممالک کے سائنسی علوم کو مقامی آبادی، خاص کر مسلمانوں میں متعارف کرانا اور فروغ دینا تھا۔ سوسائٹی کی ایک بہت بڑی لائبریری اور ایک مطالعاتی مرکز تھا۔ 1866ء میں 44 سائنسی جریدے یہاں آتے تھے جو انگریزی، فارسی اور عربی سمیت دیگر زبانوں شائع ہوتے تھے۔ سرسید کی تحریکِ علی گڑھ کے بلاواسطہ یا بالواسطہ اثر کی بدولت برصغیر بھر میں کئی لوگوں نے ملتے جلتے ادارے قائم کیے۔

سرسید اور ان کے ساتھیوں کو مسلم آبادی کی جانب سے شدید مزاحمت اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انہوں نے رجعت پسند افراد اور منظم گروہوں کے دباؤ کا مقابلہ کیا اور ایک ذی شعور اور روشن خیال جنوبی ایشیائی مسلم ذہن پیدا ہونے کے امکان کی راہ ہموار کرنے میں مدد کی۔ اس کی پاداش میں انہیں سامراج کے پٹھو کا طعنہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ یہ ماننے کی معقول وجوہ موجود ہیں کہ وہ ایک ایسے ایجنڈے پر کاربند تھے جو سامراجی حکمرانوں کے لیے موزوں تھا لیکن ان کا ارادہ چاہے جو بھی تھا، اس کے مسلمانوں کے ذہنوں پر نئے اثرات مرتب ضرور ہوئے۔ عقیدے اور فقہ پر سوال اٹھانے سے لے کر زبان اور ادب کے بارے میں خیالات کا اظہار کرنے اور طبیعی اور فطری علوم کے حصول پر اصرار کرنے اور مسلمانوں کو سیاست اور نظم ونسق میں شمولیت پر زور دینے تک، سرسید کے اقدامات بہت وسیع اور مؤثر تھے۔ سرسید کا قائم کردہ ایم اے او کالج جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بن گیا، جنوبی ایشیاء میں مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے دو دیگر بڑے اداروں جامعہ ملیہ اسلامیہ (شروع میں علی گڑھ میں قائم ہوا تھا مگر بعد میں دہلی منتقل ہوگیا) اور عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن سے پہلے قائم ہوا تھا۔

موجودہ پاکستان اور بنگلا دیش میں زیادہ تر بڑے ادارے جو ہمیں ورثے میں ملے وہ برطانوی حکمرانوں نے قائم کیے تھے یا پھر ہندو اور پارسی خیّر لوگوں نے بنائے تھے۔ کچھ ایسے اسکول یا کالج ضرور تھے جو مسلمانوں نے بنائے تھے جیسے کہ کراچی میں سندھ مدرسہ اور پشاور میں اسلامیہ کالج مگر ایسی کوئی بھی یونیورسٹی یا پوسٹ گریجوایٹ ادارہ نہیں تھا جس کی بنیاد مسلمانوں نے رکھی ہو۔ البتہ، سرسید کی تحریک کے اثر کی بدولت مسلمان جدید تعلیمی اداروں میں داخل ہونے پر آمادہ ہوئے تھے جو اُن کے متعلقہ علاقوں میں سرکار یا خیّر لوگوں نے قائم کیے تھے۔

گذشتہ پچاس برسوں میں سائنس دان اور سائنسی سوچ پیدا کرنا تو درکنار متجسس اور منطقی سوچ کا انحطاط ہوا ہے اور چیزوں کو سیکھنے اور ان میں جدت لانے کے امکانات معدوم ہوتے نظر آتے ہیں۔ اب ہم سائنسی تعلیم کے نام پر ڈاکٹر، انجینیر ز، انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ماہرین اور صنعتوں کے منتظمین پیدا کرتے ہیں۔ اگر وہ سائنسی ذہن سے محروم ہیں، ایسا ذہن جو سوال کرے، چیلنج کرے، جستجو کرے، تبدیلی اور جدت لائے اور تخلیق کرے تو پھر اُن کی حیثیت اعلیٰ درجے کے تیکنیک کار کی ہی رہے گی: ایسے پلمبر اور الیکٹریشن کی جن کے پاس چیزوں کے ڈیزائن اور ان کے اطلاق کے حوالے سے قدرے جدید طرز کی صلاحیتیں ہیں۔ ہم طبیعات دان، کیمیا دان، حیاتیات دان اور نظری سائنسدان پیدا کرنے سے کوسوں دور ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو پسماندہ معیشت میں رہنے والے لوگوں کی معاشی مجبوریاں ہیں۔ مگر ڈاکٹر عبدالسلام اور ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی ایسے لوگوں کو بھی تو اِسی طرح کی مشکلات پیش آئی تھیں۔ چنانچہ، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بطورِ عوام ہم میں یہ خواہش باقی نہیں رہی کہ ہم زندگی اور وجود کی پیچیدگیوں کا تجزیہ کریں اور اپنی مشکلات کا حل تلاش کریں۔ بھارت میں پرندوں کے علم کے ماہر (اورنیتھالوجسٹ) سلیم علی سے لے کر پاکستان میں طبیعات دان رضی الدین ایسی نادر مثالوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ مگر نظر یہی آتا ہے کہ جنوبی ایشیا کے مسلم معاشروں سے کوئی غیر معمولی کام سامنے نہیں آرہا۔

ہائی اسکول کے ایک ذہین طالبعلم کے لیے بھی یہ بات سمجھنا آسان ہے کہ ہم سائنسدان پیدا کرنے کے اہل کیوں نہیں ہیں بلکہ اس کے بجائے صرف انجینیر ز پیدا کر رہے ہیں یا حیاتیات دان پیدا کیوں نہیں کر سکتے مگر ڈاکٹر پیدا کیے جا رہے ہیں۔ طبیعی یا حیاتیاتی علوم میں نظریے اور علمیت کی اہمیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ آپ کسی ایسے فرد سے طبعیات دان یا کیمیا دان بننے کی امید کیسے کر سکتے ہیں جسے عقیدے کے معاملات کو تو چھوڑ یے دنیا میں درست تصور کیے جانے والے طبیعی قوانین کی اساس پر سوال کرنا بھی نہیں سکھایا گیا۔ اِسی طرح، ڈارون کا نظریہ ارتقاء عقیدے کی تشریح کی بنیاد پر رد کیا جاتا ہے نہ کہ سائنسی دلیل کی بنیاد پر۔ اس طرح کی صورت حال میں ڈاکٹر ز تو جنم لیتے رہیں گے

مسلم اشرافیہ میں سرسید شاید پہلے شخص تھے جنہوں نے محسوس کیا کہ مسلمان طالب علموں کو مختلف علوم پڑھانا بہت ضروری ہے۔ انہوں نے مجموعی طور پر جدید اور فکری تعلیم کی ضرورت پر بھی زور دیا جس پر اُنہیں استعماریت کا طفیلی کہا گیا۔ انہوں نے 1862ء میں ایک مترجم سوسائٹی (Translation Society) کی بنیاد رکھی جو 1864ء میں علی گڑھ سائنسی سوسائٹی (Scientific Society of Aligarh) میں تبدیل ہوگئی۔ اس اقدام کا مقصد مغربی ممالک کے سائنسی علوم کو مقامی آبادی، خاص کر مسلمانوں میں متعارف کرانا اور فروغ دینا تھا۔ سوسائٹی کی ایک بہت بڑی لائبریری اور ایک مطالعاتی مرکز تھا۔ 1866ء میں 44 سائنسی جریدے یہاں آتے تھے جو انگریزی، فارسی اور عربی سمیت دیگر زبانوں شائع ہوتے تھے۔ سرسید کی تحریکِ علی گڑھ کے بلاواسطہ یا بالواسطہ اثر کی بدولت برصغیر بھر میں کئی لوگوں نے ملتے جلتے ادارے قائم کیے۔

مگر نظریہ ارتقاء کے حامی یا مخالف حیاتیات دان پیدا نہیں ہوسکیں گے۔

جنوبی ایشیاء کے مسلم معاشروں میں نظری حساب، فلسفے، طبیعی وحیاتیاتی علوم میں کوئی نمایاں کام نہیں ہوا، اس لیے معاشرتی علوم اور علم الانسان میں محدود علم کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں ہے۔ عرفان حبیب، پروفیسر عائشہ جلال، اور ڈاکٹر مشیرالحسن جیسے تاریخ دان؛ ڈاکٹر محبوب الحق اور ڈاکٹر رحمان سبحان جیسے معیشت دان؛ ڈاکٹر حمزہ علوی جیسے ماہرینِ عمرانیات؛ زبان کی تاریخ کے علم پر عبور رکھنے والے لوگ اور معروف زبان دان جیسے کہ ڈاکٹر طارق رحمان؛ خیالات و افکار کی تاریخ اور ادب کے میدان کی نمایاں شخصیات مثلاً ڈاکٹر سید نعمان الحق؛ ادبی ناقدین جیسے کہ شمس الرحمان فاروقی۔ ایسے لوگوں کی مکمل فہرست جاننے کے لیے آپ کو ورق پلٹنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

ہمارے فن اور ادب میں تخلیقی صلاحیت کا کال نہیں ہے۔ مگر ایسے لوگ آپ کو خال خال ہی ملیں گے جن میں سراہنے، تنقید کرنے، سوچ بچار کرنے اور ہمارے فن اور ادبی منظرنامے کا احاطہ کرنے کی استعداد ہو۔ اگر تخلیقی صلاحیت کا بحران نہیں بھی تو فہم وفراست اور تخلیقی تنقید کا بحران ضرور ہے۔

تنقیدی سوچ رکھنے والے سائنسدانوں، سماجی سائنسدانوں، نظریہ سازوں اور تاریخ دانوں کے فقدان کا مطلب یہ ہے کہ ہماری نسل اور اسے دیا جانے والا علم بہت کمزور ہے۔ ہمارے معاشرے میں تاریخ کے شعور کی کمی ہے اور ایسے متاثرکُن رہبروں کی تعداد ناقابلِ یقین حد تک کم ہے جو لوگوں کو رائج الوقت تصورات پر سوال اٹھانے کا کہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی واجتماعی نفسیات جو نہ صرف ہمارے عمل وردِعمل کا تعین کرتی ہے بلکہ بطورِ عوام اس نے ہماری شناخت کا تعین بھی کرنا شروع کردیا ہے۔ یہ نفسیات چار عناصر پر مشتمل ہے: تعصب، تنہائی، خوف اور غصہ۔

جنوبی ایشیا کے مسلمان مردوں اور عورتوں کی اچھی خاصی تعداد نے بعض بنیادی سطح کے تعصّبات پال رکھے ہیں۔ دنیا میں دیگر آبادیاں بھی ہیں جو تعصّبات کا شکار ہوں گی مگر میرا زیادہ تر واسطہ اپنے لوگوں سے ہے۔ دیگر عقائد کے پیروکاروں اور اقوام کے بارے میں اِن کا علم بہت کم اور تاثر تنگ نظری پر مبنی ہے۔ جہاں تک پاکستان کی بات ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس تعصب کی وجہ عقیدے کے حوالے سے ایک خاص قسم کی یکسانیت اور دیگر قوموں اور معاشروں سے میل ملاپ کا فقدان ہے۔ مگر آپ کو جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں خاص کر اُن مسلمانوں میں جو آبائی ملک چھوڑ کر دوسری قوموں کے بیچ میں رہ رہے ہیں، "دوسرے" کا تصور اگر ہُو بہُو اِسی شکل میں نہیں تو اِس سے ملتی جلتی شکل میں ضرور نظر آئے گا۔ کسی قسم کے اختلاف سے برتاؤ کا معاملہ ہو تو بیرونِ ملک مقیم پاکستانی زیادہ سخت مزاج ہیں۔ آپ کو بنگلا دیشی اور بھارتی مسلمانوں میں بھی اسی طرح کا رویہ اور برتاؤ ملے گا۔ بھارتی مسلمان کچھ حد تک بہتر ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ اقلیت میں ہیں اور دوسری یہ کہ ان کا ہر روز دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ واسطہ پڑتا رہتا ہے۔

> ہمارے فن اور ادب میں تخلیقی صلاحیت کا کال نہیں ہے۔ مگر ایسے لوگ آپ کو خال خال ہی ملیں گے جن میں سراہنے، تنقید کرنے، سوچ بچار کرنے اور ہمارے فن اور ادبی منظرنامے کا احاطہ کرنے کی استعداد ہو۔ اگر تخلیقی صلاحیت کا بحران نہیں بھی تو فہم وفراست اور تخلیقی تنقید کا بحران ضرور ہے۔ تنقیدی سوچ رکھنے والے سائنسدانوں، سماجی سائنسدانوں، نظریہ سازوں اور تاریخ دانوں کے فقدان کا مطلب یہ ہے کہ ہماری نسل اور اسے دیا جانے والا علم بہت کمزور ہے۔ ہمارے معاشرے میں تاریخ کے شعور کی کمی ہے اور ایسے متاثرکُن رہبروں کی تعداد ناقابلِ یقین حد تک کم ہے جو لوگوں کو رائج الوقت تصورات پر سوال اٹھانے کا کہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی واجتماعی نفسیات جو نہ صرف ہمارے عمل وردِعمل کا تعین کرتی ہے بلکہ بطورِ عوام اس نے ہماری شناخت کا تعین بھی کرنا شروع کردیا ہے۔ یہ نفسیات چار عناصر پر مشتمل ہے: تعصب، تنہائی، خوف اور غصہ۔

جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے اِس رویے کا سبب دیگر معاشروں کے بارے میں ان کی لاعلمی اور یہ وہم ہے کہ دنیا انہیں مٹانے کے درپے ہے۔ اِس وہم کی ایک وجہ تو ان کی اپنی ناکامی ہے اور دوسری وجہ نئے استعماری عزائم پر مبنی مغربی سیاست کی نئی لہر کا ابھرنا ہے۔ تاہم اِس کی وجوہ جو بھی ہوں اور اُن وجوہ کے ذمہ دار آپ خود ہوں یا دوسرے، اگر آپ نے دنیا بھر میں ایسے تمام لوگوں کے خلاف تعصب کا شت کر رکھا ہے جو مختلف بولی بولتے ہیں، مختلف انداز میں عبادت کرتے ہیں یا عبادت کرتے ہی نہیں تو پھر دیگر معاشروں میں آپ کبھی کسی کو اپنا ساتھی، دوست، اتحادی اور رفیق نہیں بنا پائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ اپنے سے مختلف کسی بھی فرد کے ساتھ بات چیت نہیں کرسکیں گے یا ورنہ ہی اجتماعی انسانی معاشرے اور ثقافت کو سمجھ پائیں گے۔ دوسروں کے خلاف تعصب کی بنیاد یہ یقینِ محکم ہے کہ ہم اپنے ایمان اور طرزِ زندگی کی بدولت نہ صرف دوسروں سے برتر ہیں بلکہ ہم ہی ہیں جو صحیح راستے پر ہیں۔ یہ خود ساختہ پارسائی صرف مذہب کی حد تک نہیں ہے۔ یہ فِرقوں، ذیلی فرقوں کے اندر، فرقوں اور ذیلی فرقوں میں مکتبہ ہائے فکر تک وسیع ہے بلکہ بعض اوقات کسی ایک ادارے یا فرد کی جانب سے انتہائی تنگ نظر تشریح میں بھی آپ کو اس کی جھلک نظر آئے گی۔

جنوبی ایشیاء کے مسلمان تنہائی کو خود اپنے اوپر تھوپ رہے ہیں۔ ہمارے ایسے کئی مذہبی اور سیاسی رہنماء ہیں جو اپنے حامیوں کے پُرجوش مجمع سے کہتے ہیں کہ مسلم ممالک کو اقوامِ متحدہ چھوڑ دینی چاہیے اور اپنی یونین بنانی چاہیے۔ یہ بات کرتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ کئی عرب ریاستوں سمیت متعدد ملکوں کی پروازیں تل ابیب جاتی ہیں اور وہ باقی دنیا کے ساتھ اپنے تعلقات مستحکم کررہے ہیں۔ مگر جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کی عالمی اتحاد اسلامی کی خواہش ختم نہیں ہورہی باوجود اس حقیقت کے کہ ان کے سوا کسی اور کو اِس خیال سے تقریباً کوئی دلچسپی نہیں۔

وسیع وعریض دنیا سے علیحدگی اور متنوع معاشروں کے بیچ رہتے ہوئے دوسری اقوام سے کٹ کر رہنے کی شدید خواہش کا جنوبی ایشیاء کی مسلمان آبادی کے ذہن پر ایک خاص اثر ہے اور اِس کی وجہ سے بھی مسلم معاشروں میں کم نظر، عورت دشمن، نسل پرست اور سماجی طور پر نااہل افراد اور گروہوں کی افزائش ہورہی ہے۔ دنیا کی واضح اکثریت ایسے عقائد پر عمل پیرا ہے اور نظریات پر یقین رکھتی ہے جو ہمارے عقائد اور نظریات سے مختلف ہیں۔ اسلام کے اندر فرقہ واریت نے بھی جنوبی ایشاء کے مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ لہٰذا ہم نے جو تعصّبات کاشت کر رکھے ہیں اور جو تنہائی خود پر تھوپ رکھی ہے، اس نے ہمیں مشتعل کر رکھا ہے۔ ہم غصے میں ہیں اور اس کی وجہ سے ہم ناخوش ہیں۔ اگر ہم نے سوال اٹھانے اور چیلنج کرنے والے ذہنوں کی آبیاری نہ کی اور تنقیدی اور مکالمہ کرنے والا رویہ اختیار نہ کیا تو پھر تنزلی کی طرف ہمارا سفر رُک نہیں پائے گا۔

حارث خلیق شاعر، مضمون نگار اور ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے سیکریٹری جنرل ہیں۔

(بشکریہ راوی، لاہور،
انگریزی سے ترجمہ: ندیم عبّاس)

پاکستان میں بنیادی آزادیوں پر پابندیوں کے خلاف جدوجہد کی ضرورت

لاہور پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے 6 اکتوبر 2019 کو اپنے سیکریٹریٹ میں " پاکستان میں بنیادی آزادیوں پر پابندیوں کے خلاف جدوجہد کی ضرورت" کے موضوع پر ایک عوامی سیمینار کا انعقاد کیا۔ اس موقع پر انسانی حقوق کے معروف کارکنوں، ماہرین تعلیم، وکیلوں اور صحافیوں نے پاکستان میں اظہار اور انجمن سازی کی آزادی پر بڑھتی ہوئی پابندیوں کا جائزہ لیا، خاص طور پر ریاستی بیانیے سے اختلاف رائے پر پابندیوں کا اور اس بات کا جائزہ بھی لیا گیا کہ بنیادی انسانی حقوق کے لیے گھٹن کی فضا کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ مقررین کا یہ بھی کہنا تھا کہ آج کے دور میں حقوق پر ریاستی جبر ضیاء الحق کے مارشل لاء کے جبر سے بھی زیادہ شدید نوعیت کا ہے۔ انہوں نے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں، قانونی اور تعلیمی حلقوں اور سول سوسائٹی پر زور دیا کہ وہ اس صورتحال کو مزید خراب ہونے سے بچانے کی کوشش کریں۔

ایچ آر سی پی کے سیکریٹری جنرل حارث خلیق نے سیمینار کے آغاز میں کمیشن کے چیئر پرسن ڈاکٹر مہدی حسن کے ایماء پر جاری ہونی والی ایک پریس ریلیز پڑھی۔ اس پریس ریلیز میں ایچ آر سی پی نے ریاست کے ہر اس اقدام کی مذمت کی جس کا مقصد اظہار اور انجمن سازی کی آزادی، خاص طور پر سیاسی اختلاف رائے اور صحافت کو دبانا تھا۔ ایچ آر سی پی نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ جبری گمشدگیوں کو جرم قرار دینے کے لیے قانون سازی کی جائے، گلگت بلتستان کو صوبے کا درجہ دینے کی ضمانت دی جائے اور نقصان دہ ماحولیاتی تبدیلیوں سے تحفظ کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ سرحد کے دونوں اطراف کشمیر میں انسانی حقوق کی صورتحال بھی اجاگر کی گئی۔ کہا گیا کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں لوگ انسانی حقوق سے محروم ہیں جبکہ آزاد کشمیر کے لوگوں کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے۔ خیبر پختونخوا میں حال ہی میں ایک آرڈیننس کے ذریعے ایکسٹرزان ایڈ آف سول پاور کے نفاذ کی بھی مذمت کی گئی۔ بچوں کو بدسلوکی سے تحفظ، اور مذہبی امتیاز کا خاتمہ، نیز صحت اور تعلیم جیسے نظرانداز شدہ شعبوں میں مالیاتی سرمایہ کاری ایسے مطالبات بھی ایچ آر سی پی کی پریس ریلیز کا حصہ تھے۔

عوامی سیمنار کی نظامت کی ذمہ داری سینیئر صحافی اور ایچ آر سی پی کے کونسل رکن غازی صلاح الدین ادا کی۔ انہوں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں کہا کہ اس تقریب کا مقصد ایک ایسے وقت میں ان موضوعات پر بحث مباحثے کے لیے کھلی جگہ فراہم کرنا تھا جب جگہیں تنگ کی جا رہی ہیں۔ اس لیے، ان حالات میں حق سچ کی بات کرنا اور انسانی حقوق کے لیے آواز بلند کرنا از حد اہم ہے۔

پینل کی پہلی مقرر معروف وکیل اور ایچ آر سی پی کی کونسل رکن حنا جیلانی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ موجودہ سماجی و سیاسی ماحول میں انسانی حقوق کا تحفظ مشکل کام ہے مگر وہ مایوس نہیں کیونکہ اظہار کی آزادی پر ریاستی پابندیوں کے باوجود ایچ آر سی پی کی جدوجہد جاری و ساری ہے۔ سیاسی جماعتوں پر تنقید کرنا عوام کا بنیادی حق ہے اور ریاست بغیر کسی جواز کے لوگوں کے خلاف کارروائیاں کر کے انہیں اس حق سے محروم کر رہی ہے۔ محترمہ جیلانی کا کہنا تھا کہ ریاست کے بجائے سویلین شعبوں میں فوج کی بے جا مداخلت بنیادی آزادیوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے، سیاستدان تنقید کا آسان ہدف ہیں جبکہ فوج کے مارواے قانون اقدامات پر کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوتی۔ انہوں نے کہا کہ جبری گمشدہ افراد کے کمیشن کے سربراہ کو مستعفی ہونا چاہیے کیونکہ وہ نہ تو خودمختار ہے اور نہ ہی اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حامل شخصیت ہے۔

جبری گمشدہ افراد کے اعداد و شمار اتنے اہم نہیں ہیں جتنے اہم یہ جاننا ہے کہ انہیں کہاں سے بازیاب کیا گیا، انہیں اغوا کیوں کیا گیا اور اور جب وہ لاپتہ تھے تو اس دوران کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا گیا۔

پینل کے دوسرے مقرر ساؤتھ ایشیا پارٹنرشپ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر اور انسانی حقوق کے ممتاز کارکن محمد تحسین تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم میں سے کوئی بھی مثالی ریاست میں کبھی نہیں رہا قطع نظر اس کے کہ اقتدار میں کون رہا ہے۔ غیر مسلم، عورتیں اور دیگر مذہبی اقلیتیں بدستور خطرات کی زد میں ہیں۔ انہوں نے اس رائے سے اتفاق کیا کہ ملک میں منفرد نوعیت کا مارشل لاء ہے جس میں لوگوں اور ریاست کے مابین رابطے کے ذرائع بند ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ مختلف امور کے حوالے سے کس قسم کے اقدامات کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے، مثال کے طور پر لاپتہ افراد کا مسئلہ ہے، اظہار کی آزادی پر پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں جیسے کہ تنظیمیں معمولی سی وجوہ پر بند کی جا رہی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ ان کے عملے میں شیعہ مسلک لوگ کام کرتے ہیں یا انہوں نے عورت مارچ میں شرکت کی تھی۔ سیاسی جماعتیں کسی مشترکہ ایجنڈے پر متفق نظر نہیں آتیں اور موجودہ وزیراعظم سیاسی مخالفت کو تمام سابق سربراہان حکومت سے زیادہ ناپسند کرتے ہیں۔ محترم تحسین نے کہا کہ موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ ہم نہ صرف اپنے حقوق کا دعویٰ کریں بلکہ انہیں پرزور طریقے سے منوائیں کیونکہ ہمارے انسانی حقوق کی ضمانت ریاست نے نہیں بلکہ آئین نے دی ہے۔ اس لیے اگر ہم اپنے انسانی حقوق چاہتے ہیں تو ہمیں ان کے لیے آواز اٹھانی ہوگی۔

ہیرالڈ میگزین کے مدیر بدر عالم نے کہا کہ ریاست صحافت کی آزادی کو دبا رہی ہے۔ انہوں نے ہیرالڈ کے ساتھ اپنی وابستگی کے دوران پیش آنے والے مسائل کا ذکر کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ لوگوں کو ان کی زمین سے بے دخل کرنے، پشتون تحفظ موومنٹ (پی ٹی ایم) اور بعض دیگر معاملات پر لکھا گیا تو انٹیلی جنس ایجنسیوں نے اس کی اتنی زیادہ مخالفت کی کہ وہ انہیں شائع نہ کر سکے۔ اس ریاستی سنسر شپ نے سیلف سنسر شپ کو جنم دیا کیونکہ ڈان میڈیا گروپ نے ہیرالڈ کی ٹیم کو لمز میں کھلی بحث مباحثے کی تقریبات میں

> پینل کی پہلی مقرر معروف وکیل اور ایچ آر سی پی کی کونسل رکن حنا جیلانی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ موجودہ سماجی و سیاسی ماحول میں انسانی حقوق کا تحفظ مشکل کام ہے مگر وہ مایوس نہیں کیونکہ اظہار کی آزادی پر ریاستی پابندیوں کے باوجود ایچ آر سی پی کی جدوجہد جاری و ساری ہے۔ سیاسی جماعتوں پر تنقید کرنا عوام کا بنیادی حق ہے اور ریاست بغیر کسی جواز کے لوگوں کے خلاف کارروائیاں کر کے انہیں اس حق سے محروم کر رہی ہے۔ محترمہ جیلانی کا کہنا تھا کہ ریاست کے بجائے سویلین شعبوں میں فوج کی بے جا مداخلت بنیادی آزادیوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے، سیاستدان تنقید کا آسان ہدف ہیں جبکہ فوج کے مارواے قانون اقدامات پر کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوتی۔ انہوں نے کہا کہ جبری گمشدہ افراد کے کمیشن کے سربراہ کو مستعفی ہونا چاہیے کیونکہ وہ نہ تو خودمختار ہے اور نہ ہی اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حامل شخصیت ہے۔

شرکت کی منظوری نہ دی۔ محترم عالم نے کہا کہ صحافت پر پابندیاں ناشروں اور مصنفین پر بہت زیادہ اثر انداز ہو رہی ہے اور کہا کہ صحافت کے شعبے میں امانت و شفافیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جس کے بغیر صحافی اور پبلشر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر بات نہیں کر سکتے۔

لمز یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر علی عثمان قاسمی سیمینار میں پروگریسو اکیڈیمک کلیکٹو (پی اے سی) کی نمائندگی کی۔ ان کا کہنا تھا کہ تعلیم کے شعبے سے وابستہ لوگوں نے بھی سنسر شپ کے حوالے سے خوف کی فضا کو اختیار کر لیا ہے، اس حد تک کہ لمز اور حبیب یونیورسٹی جیسے تعلیمی اداروں نے بھی اپنے ہاں اظہار رائے کو محدود کر لیا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ 2014 میں لمز میں 'بلوچستان بے آواز نہیں رہا' کے موضوع پر ایک سیمینار ہونا تھا جس میں ماما قدیر جیسے کارکنوں نے جبری گمشدگی کے مسئلے پر گفتگو کرنا تھی مگر حساس اداروں کے اہلکاروں نے وہ تقریب منعقد نہ ہونے دی۔ انہوں نے پی ٹی ایم پر ایک سیمینار اور ہندی زبان پر ایک ورکشاپ ملتوی ہونے کا ذکر بھی کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ورکشاپ کو ریاست مخالف کہہ کر اسے منعقد کرنے کی اجازت نہ دی گئی باوجود اس کے کہ وہ صرف ایک زبان سے متعلقہ کورس تھا۔ گورنمنٹ کالج کے طالبعلموں نے بھی کہا کہ ان کے ادارے میں بھی اسی طرح کی پابندیوں کی فضا ہے۔ ڈاکٹر قاسمی کہ کہنا تھا کہ تحریر و تقریر کی آزادی کے حق کو یقینی بنوانے کے لیے آئینی ترامیم ضروری ہیں۔ انہوں نے آئین کے آرٹیکل 19 کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ آرٹیکل کئی پابندیاں عائد کرتا ہے اور اعلیٰ تعلیمی کمیشن نے تعلیمی اداروں میں جماعتِ اسلامی جیسی مذہبی جماعتوں کے طلباونگ کے وجود کو برقرار رکھنے اور مطالعہ پاکستان اور اسلامیات جیسے موضوعات میں پڑھائے جانے والے نصاب کی کڑی نگرانی جیسے رجعت پسند اقدامات کیے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ریاست نے شہری کی تعریف متعین کرتے وقت شہری کی لسانی، مذہبی، یا علاقائی وابستگی کو مدنظر نہیں رکھا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ پاکستان میں ثقافتی اظہار کی نئی شکلوں کی ضرورت ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ سماجی علوم اور قدرتی علوم کے طلبا میں تنقیدی سوچ کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ فسطائیت کا مقابلہ ممکن ہو سکے۔

بولو بھی کی شریک بانی اور ڈیجیٹل حقوق کی کارکن فریحہ عزیز بھی مقررین میں شامل تھیں۔ محترمہ فریحہ نے 2016 سائبر کرائم بل اور اس کے اثرات پر بات کی۔ انہوں نے کہا کہ اب یہ کہنا درست نہیں کہ مرکزی ذرائع ابلاغ کی نسبت سوشل میڈیا پابندیوں سے قدرے آزاد ہے اور اب سوشل میڈیا پر آزادی کے ساتھ اظہار خیال ممکن نہیں رہا کیونکہ سائبر کرائم بل کی دفعہ 20 نے ٹیلی کمیونیکیشنز اتھارٹی (پی ٹی اے) کو غیر معمولی اختیارات دیے ہیں اور وہ کسی بھی ایسے فرد کو ہدف بنا سکتی ہے جو کوئی ایسی چیز پوسٹ کرے جس سے ریاست ناراض ہو سکتی ہو، اور پی ٹی ایم کے متعلق پوسٹوں سے یہ حقیقت عیاں ہو گئی ہے۔ پی ٹی اے وفاقی تحقیقاتی ایجنسی کے ساتھ مل کر ایسی پوسٹوں کو فوری طور پر ہٹانے کی کوشش کرتی ہے۔ عوامی ورکرز پارٹی (اے ڈبلیو پی) کے بارے

بعض قوتوں کی ذریعے حکومتوں کی تبدیلی پر بھی بات کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کہ یہاں ملک میں جمہوری حکومتوں کے لبادے میں کئی اور طاقتوں کا نظام چل رہا ہوتا ہے۔ موجودہ انتظامیہ کے زیرِ سایہ لوگوں کو اٹھا کر غائب کرنے کا سلسلہ جاری و ساری ہے اور مختلف شعبوں کو وفاقی بجٹ غیر مساوی طور پر مختص ہوا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کی ترجیحات غلط ہیں۔ مختلف شہروں میں طالبان کا اثر و رسوخ بھی بڑھ رہا ہے۔

میں سوشل میڈیا پر تمام پوسٹیں ہٹا دی گئیں۔ ناجائز طور پر پوسٹیں ہٹانے اور لوگوں کو آن لائن نشانہ بنانے کے خلاف شکایت درج کروانے کا کوئی مؤثر نظام موجود نہیں۔ اس کے علاوہ، جن لوگوں کو گرفتار کیا جاتا ہے انہیں وکیل کی خدمات لینے اور ضمانت کروانے میں شدید مشکلات درپیش ہیں۔ ایسے لوگوں کی مدد کا نظام متعارف ہونا چاہیے۔ ایسے ادارے اکثر لوگوں کی ذاتی ڈیوائسز جیسے کہ موبائل فون وغیرہ ضبط کر لیتے ہیں اور یہ ایک تسلیم شدہ رجحان بن چکا ہے باوجود اس کے کہ بغیر کسی وارنٹ کے ایسا کرنا غیر قانونی ہے۔ آن لائن جنسی ہراسانی کے واقعات پر بھی کسی کی حقیقی جوابدہی کے بجائے صرف ہتک عزت کے دعوے ہوتے ہیں۔ محترمہ فریحہ نے کہا کہ یہ تمام واقعات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ایک ایسی ریاست کی نشاندہی کرتے ہیں جو آن لائن آزادیوں کی کڑی نگرانی کر رہی ہے اور علم کے پھیلاؤ اور فرد کی تحریر و تقریر کی آزادی کو متاثر کر رہی ہے۔ ایسی سخت پالیسیوں کی مخالفت کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ نوجوان نسل میں پہلے سے یہ تاثر پیدا ہو چکا ہے کہ حقوق دینا اور پھر واپس لے لینا ریاست کا کام ہے، حالانکہ یہ آئین ہے جو حقوق دیتا ہے اور ریاست کے اختیارات اور ذمہ داریوں کا تعین کرتا ہے۔ انہوں نے کہا یہ چیز سمجھنا ہو گی کہ غلط معلومات ہی واحد مسئلہ نہیں ہے کیونکہ ریاستی بیانیے کی مخالفت میں رائے زنی پر بہت زیادہ حملوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پینل کے چھٹے مقرر سینیٹر افراسیاب خٹک تھے جنہوں نے موجودہ حالات کا تاریخ پس منظر بیان کیا اور مختلف ترامیم، فوجی مداخلتوں اور عدلیہ کی بڑھتی ہوئی سیاست زدگی جس نے حالات اس نہج تک پہنچائے ہیں، کا مفصل ذکر کیا۔ ان کے مطابق، اظہار کی آزادی جمہوری معاشرے کے لیے ضروری ہوتی ہے اور یہ کہ سیاسی جماعتوں نے اس پر پابندیوں کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بعض قوتوں کی ذریعے حکومتوں کی تبدیلی پر بھی بات کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کہ یہاں ملک میں جمہوری حکومتوں کے لبادے میں کئی اور طاقتوں کا نظام چل رہا ہوتا ہے۔ موجودہ انتظامیہ کے زیرِ سایہ لوگوں کو اٹھا کر غائب کرنے کا سلسلہ جاری و ساری ہے اور مختلف شعبوں کو وفاقی بجٹ غیر مساوی طور پر مختص ہوا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کی ترجیحات غلط ہیں۔ مختلف شہروں میں طالبان کا اثر و رسوخ بھی بڑھ رہا ہے۔

اس کے بعد سوالات و جوابات کی نشست ہوئی جس میں شرکا نے بہت سے سوالات کیے۔ بعض شرکا نے مقررین کی گفتگو سے اتفاق کیا اور کہا کہ پسند و ناپسند کی بنیاد پر احتساب کا سلسلہ رکنا چاہیے اور کہا کہ یہ صورتحال مارشل لاء سے ملتی جلتی ہے۔ اس نشست کے دوران، ایچ آر سی پی کے چیئر پرسن ڈاکٹر مہدی حسن نے کہا کہ ہر فرد کو سب سے بڑھ کر سچائی اور شفافیت کا ساتھ دینا چاہیے اور ان دلیرانہ آراء کے نتیجے میں ملنے والی دھمکیوں کا بہادری کے ساتھ سامنا کرنا چاہیے۔ چنانچہ، سچائی کے لیے کھڑے ہونے کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

سوالات و جوابات کی نشست کے بعد ایچ آر سی پی کے اعزازی ترجمان اور معروف صحافی آئی اے رحمان نے اختتامی کلمات کہے۔ انہوں نے کہا کہ آئین کی پاسداری نہ کرنے پر ریاست پر سوال کون کرے گا اور اسے ذمہ دار کون ٹھہرائے گا؟ یہاں ایک منظّم اور سرگرم سول سوسائٹی کی ضرورت پیدا ہوتی ہے، خاص طور پر ان لوگوں کی حفاظت کے لیے جو فرقہ واریت کے حوالے سے ریاستی پالیسیوں کا نشانہ بن رہے ہیں، مثال کے طور پر عورتیں اور مذہبی اقلیتیں۔ انہوں نے کہا کہ بلوچستان میں 62 یونینوں پر پابندی تشویش کا باعث ہے اور مطالبہ کیا کہ حکومت لاپتہ افراد کے کمشین کی رپورٹ منظر عام پر لائے اور اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ لوگوں کو حراست میں رکھنے کا اختیار صرف پولیس کو ہے اور یہ کہ ایجنسیوں کی حراست سے بازیاب ہونے والے لوگوں کی دادرسی کی جائے۔

مزاحمت کی درخشاں تاریخ

زاہدہ حنا

نوآبادیاتی طاقتوں نے سترہویں صدی سے رفتہ رفتہ برصغیر پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ وہ کام جو پہلے تجارت کے پردے میں شروع ہوا تھا، آخرکار سقوطِ مملکت پر اختتام پذیر ہوا۔

1757 سے ہی ہندوستانی قوم پرستوں نے پرتگیزیوں، ولندیزیوں، فرانسیسیوں اور آخرکار برطانوی قابضین سے جم جم کر لڑائی لڑی، ان کی مزاحمت کی تاریخ پڑھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آج اگر ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں تو اس کا سبب وہ ان گنت گم نام شہید ہیں جو اس راہ میں قربان ہو گئے۔ چند دن پہلے ایک سیمینار میں جانے کا اتفاق ہوا جس کا موضوع تھا ''مزاحمت کا سماج کو آگے بڑھانے میں کیا کردار ہے؟''

سچ پوچھیے تو کسی بھی سماج کو آگے بڑھانے میں اصل کردار اس کے لوگوں کی مزاحمت کا ہوتا ہے۔ مزاحم ہونے والے جس قدر مقاومت کا مظاہرہ کرتے ہیں، اسی قدر کوئی سماج آگے بڑھتا ہے اور لوگوں کو اپنے حالات بدلنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اگر ہم مزاحمت کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیں تو ایک بالکل سامنے کا نام یونانی ڈراما نویس سوفوکلیز کا ہے۔ جس نے کئی صدی قبل مسیح ''اینٹی گنی'' کا کردار تخلیق کیا۔ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی وہ لڑکی جو ناز و نعم میں پلی بڑھی، اس کا رشتہ بادشاہ وقت کے بیٹے یعنی ولی عہد سے طے ہے۔ تقدیر اسے ایک ایسے موڑ پر لے آتی ہے جہاں اس کے دونوں سگے بھائی آپس میں لڑتے ہوئے مارے جاتے ہیں۔

بادشاہ کے حکم پر ایک بھائی کو سرکاری اعزاز کے ساتھ دفن کیا جاتا ہے اور دوسرے بھائی کے لیے بادشاہ وقت کا حکم ہے کہ اس کی خاک بہ سر لاش میدان جنگ سے اٹھائی نہ جائے۔ اسے گدھ نوچیں اور گیدڑ کھائیں۔ اس لیے کہ یہ ایک غدار کی لاش ہے۔ اسے دفن کرنے کی کوشش کرنیوالا بھی غدار سمجھا جائے گا اور اس کی سزا بھی موت ہوگی۔ اینٹی گنی اپنے بھائیوں کے انجام سے بہت آزردہ اور دل گرفتہ ہے لیکن جب اسے دونوں بھائیوں کی لاشوں کے ساتھ ہونے والے برتاؤ کا علم ہوتا ہے تو وہ بے قرار ہو جاتی ہے۔

تہیہ کرتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کی بے حرمتی نہیں ہونے دے گی۔ وہ تن تنہا بھائی کو دفن کرتی ہے اور بادشاہ کا عتاب اس پر نازل ہوتا ہے۔ وہ موت کی حقدار ٹھہرتی ہے، اس کا منگیتر اور بادشاہ کا اکلوتا بیٹا اینٹی گنی کی ہلاکت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتا اور خودکشی کر لیتا ہے۔

المیہ نگاری کا ایک بے مثال قصہ، اس ڈرامے کو لکھتے ہوئے ہوسکتا ہے کہ سوفوکلیز کے ذہن میں پرومی تھیس کا اساطیری کردار رہا ہو جس نے رب الارباب زیوس کی حکم عدولی کی تھی، کمزور اور مجبور انسان کو آگ جلانا، لکھنا پڑھنا سکھایا اور دنیا کے کئی علوم سے آگاہ کیا تھا، اسی جرم کی سزا میں وہ 30 ہزار برس تک دو چٹانوں کے درمیان زنجیروں سے باندھ دیا گیا۔ دن بھر ایک گدھ اس کا کلیجہ نوچتا اور چباتا، رات میں شبنم اس کے زخموں پر مرہم بن کر برستی اور یوں حکم عدولی کی سزا پرومی تھیس نے تیس ہزار برس بھگتی۔

یہی کہانیاں تھیں جنہوں نے 400 صدی میں اسکندریہ کی نو فلاطونی فلسفی ایک بے دین، ذہین اور حسین ہائی پاشیا کو آزادانہ سوچنے پر مجبور کیا اور نتیجے میں وہ اپنے مسیحی شاگردوں کے ہاتھوں سنگسار کی گئی۔ لاش اس کی گلیوں میں گھسیٹی گئی، وہ جو ریاضی دان اور سائنسدان تھی، جس نے اصطرلاب اور ہائیڈرو میٹر ایجاد کیا تھا۔ جس کے دور کے نامی گرامی فلسفی اس کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے وہ اپنے جوشیلے شاگردوں کے ہاتھوں خاک میں ملا دی گئی۔

یہ وہی تھی جس نے کچھ اور دیوانوں کو سماج کے نئے اور مشکل راستوں پر چلنے کی توفیق دی۔ یہ چین کا لائی سیون تھا جس نے عیسوی دور کے ابتدائی برسوں میں کاغذ ایجاد کیا، اسے انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ لیکن پھر شہنشاہ مکرم کسی بات پر ناراض ہوئے تو لائی سیون نے نہایت اہتمام سے خودکشی کر لی۔ اس کے خیال میں یہی عزت کا راستہ تھا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو سماج کی ترقی میں روڑے اٹکانے والوں کی راہ میں سینہ سپر ہو رہے تھے اور اپنے اپنے طور پر انسانوں کو ایک بہتر سماج کی طرف لے جا رہے تھے۔

ہم لکھنے والے قلم سے مزاحمت کرتے ہیں اور سماج کی ترقی میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ اہم یہ بات ہے کہ لکھی ہوئی بات لوگوں تک پہنچ سکے اور انھیں سوچنے پر مجبور کر سکے۔ اس حوالے سے ایک بڑا نام جون ٹوین کا ہے۔

سوچیں تو سہی کہ اگر جون ٹوین نہ ہوتا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر اس نے شاندار مزاحمت نہ کی ہوتی تو آج ہماری آزادی تحریر کہاں ہوتی۔ گھر بار اس کا بھی تھا۔ بچے اس کے بھی تھے، غربت اس کے دروازے پر بھی کنڈلی مارے بیٹھی تھی لیکن اس نے آزادی تحریر کی راہ میں اپنی جان سے مزاحمت کی اس کا سر نشان عبرت بنا رہا، اس کے بدن کے چار ٹکڑوں نے لندن کے پرندوں کی بھوک مٹائی لیکن ٹوین کے لبوں پر بادشاہ کی ناپسندیدہ کتاب لکھنے والے کا نام نہ آیا تھا۔

اس حوالے سے دیکھیے تو مسلم سماج بہت سست رفتاری سے آگے بڑھا ہے۔ اس کے راستے میں شہنشاہوں کی خواہشوں کے جنگل اور فقیہوں کے فتوؤں کے پہاڑ کھڑے رہے۔ حسینؓ ابن علیؓ، امام ابوحنیفہؒ، امام حنبلؒ، امام مالکؒ، منصور حلاج، رازی اور ابن رشد، شیخ مقتول، حضرت شہاب الدین سہروردی، کون تھا جو اپنے افکار و خیالات کی وجہ سے جان سے نہیں گیا یا اس نے سالہا سال کی قید و بند نہ کاٹی۔

یہ مغربی سماج کی خوش بختی ہے کہ وہاں مزاحمت کرنے والے صف در صف تھے۔ اسی مزاحمت نے انھیں مستقل جدوجہد اور مقاومت میں رکھا۔ سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ ان کے سماج نے بادشاہت کو لپیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے، جمہوریت، مارکسزم، سوشل ازم اور جانے کون کون سے معاملات اٹھا لیے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ وہ ٹرمپ جیسے رجعت پسندوں کو بھگتنے کے باوجود آگے بڑھ رہے ہیں۔ مریخ پر اپنا خلائی جہاز اتار رہے ہیں اور ہم مفتی منیب اور مفتی پوپلزئی کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہیں۔

مزاحمت کا معاملہ ہمارے خیالات، رویوں اور رجحانات سے جڑا ہوا ہے اور اس سے بھی کہ ہم مزاحمت کی راہ میں کتنی قربانیاں دے سکتے ہیں۔ آج کے دور میں ہم میں سے کتنے ولی بابر، سلیم شہزاد، مشال خان، شکیل اوج اور ظفر عارف بن سکتے ہیں یا نہیں۔ ہم خاموشی کو راہ نجات خیال کرتے ہیں جب کہ سماج کے ارتقا کی راہ میں چپ رہنا سب سے بڑا گناہ ہے۔

اس حوالے سے دیکھیے تو اپنے سندھ کی وہ تاریخ یاد آتی ہے جو بہت پرانی نہیں ہے لیکن ہم میں سے بہت لوگ اسے فراموش کر چکے ہیں۔ اس بات پر سندھ اسمبلی داد کی حقدار ہے کہ اس نے متفقہ طور پر 1983 کی بحالی جمہوریت، یعنی ایم آر ڈی کی تحریک میں جان سے جانے والے گمنام دیہاتیوں کو خراج عقیدت ادا کیا۔ یہ وہ 16 لوگ تھے جنہوں نے ضیاء الحق کی فاشسٹ حکومت کے خلاف چلنے والے گیارہ سیاسی جماعتوں کے اتحاد کا ساتھ دیا تھا۔ یہ تحریک جو 14 اگست 1983 سے چل رہی تھی اور جس کا انجام یکم اکتوبر 1983 کو نواب شاہ کے دیہات پنھل خان چانڈیو (آج کا ضلع بے نظیر آباد) میں 14 افراد کے قتل کے طور پر سامنے آیا۔

یہ ان جیالے اور جیوٹ افراد کا سیاسی شعور تھا جس نے انھیں جمہوریت کی بحالی کے لیے جان سے گزر جانے کی ترغیب دی۔ ایم آر ڈی کی تحریک چاروں صوبوں میں چلی تھی اور اس میں سب سے شاندار رندرانہ سندھ میں پنھل خان چانڈیو کے دیہاتیوں نے دیا تھا۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ بات طے ہے کہ ظلم و جبر کے خلاف جس سماج نے جتنی زیادہ مزاحمت کی وہ ملک اور سماج آج دنیا کے سب سے زیادہ جمہوری اور روشن خیال ملک ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ ایکسپریس)

ہم اپنی نئی نسل کی بچیوں کو صدیوں پیچھے دھکیلنا چاہتے ہیں

قیصرہ اکرام

سنا ہے وقت ہمیشہ آگے جاتا ہے اس لیے بڑے اپنے بچوں کو ہمیشہ مستقبل کے بارے میں فکر کرنے کو کہتے ہیں کہ جو گزر گیا سو گزر گیا اب آگے کی سوچو۔ ہر پہلی نسل یہ کوشش کرتی ہے کہ وہ آنے والی نسل کے لیے کچھ بہتر چھوڑ کر جائے تا کہ اس کے لیے زندگی گزارنا قدرے آسان ہو۔

لیکن یہ بات ہر جگہ صادق نہیں آتی، جیسے میرے دیس پاکستان میں۔ پوری دنیا میں اس بات کا چرچا اور تھوتھو ہے کہ یہ ملک اپنی آدھی آبادی (عورتوں) کے ساتھ ناروا سلوک رکھتا ہے۔ ان کو برابر کا انسان ماننے کو تیار نہیں۔ ان کے لیے برابر کے معاشی اور معاشرتی مواقع فراہم کرنے سے انکاری ہے۔ جبکہ باقی دنیا اپنی ماضی کی غلطیوں پر شرمندہ ہے اور انہیں سدھارے کے لیے دن رات کوئی نہ کوئی نئی ترکیب سوچتی ہے تا کہ ماضی کے اس نابرابری اور ناہمواری کے خلا کو پر کر سکے جس سے معاشرے کا توازن بحال ہوگا۔

دوسری طرف ہم ہیں جو وقت کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر اسے پیچھے کھینچنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وقت کے ساتھ چلنا سراسر کم عقلی اور دوسروں کی نقل کرنا ہے۔ اس سے ہماری معاشرت خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہم اپنی عورتوں کو وہ آزادیاں ہرگز نہیں دیں گے جس کی دنیا بات کر رہی ہے۔ ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو گھر کی چار دیواری کے اندر قید رکھتے ہیں اور اگر ان کو باہر نکلنا بھی ہو تو اس حالت میں نکلتی ہیں کہ ان پر انسان ہونے کا گمان نہیں ہوتا۔ اور اس طرح وہ ہماری درندگی سے بھی محفوظ رہ پاتی ہیں۔

پتہ نہیں وہ کونسی اور کیسی دنیا ہے جہاں بچیوں اور عورتوں کی خودمختاری کی باتیں ہوتی ہیں۔ ان کو یہ حق دیا جاتا ہے وہ زندگی میں جو کرنا چاہیں کر سکتی ہیں۔ یہ ان کا انتخاب ہے کہ وہ جو پڑھنا چاہیں پڑھیں، عملی زندگی میں جس فیلڈ میں جانا چاہیں جائیں۔ اپنے لیے جیسے جیون ساتھی کا انتخاب کرنا چاہتی ہیں کریں۔ اور جو پہننا چاہتی ہیں پہنیں۔ آخر کو یہ ان کی اپنی زندگی ہے جس کے سارے فیصلے بھی انہی کو کرنے چاہیں۔

مردان میں چینہ کے ایک مڈل سکول میں تقسیم ہونے والے شٹل کاک برقعے اس بات کا ثبوت ہیں کہ بچیوں اور اور عورتوں کے ساتھ ہونے والی بدسلوکیوں اور زیادتیوں کا ہمارے پاس ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ عورتوں سے ان کی شناخت چھین لی جائے ان کو ان کے وجود سے ہی انکاری کر دیا جائے تا کہ وہ اپنے بارے میں سوچنا اور سوال کرنا ہی چھوڑ دیں۔ جب وہ معاشرے میں نو باڈی کے طور پر چلیں گی تو وہ یہ سوچنا ہی بھول جائیں گی کہ ان کی بھی کوئی حیثیت ہے، مرضی اور منشا ہے۔ کچھ حقوق ہیں جو پیدائشی طور پر ان کے ہیں۔ وہ صرف اس حساس کے ساتھ باہر نکلے گی کہ اس کی وجہ سے لوگوں کے جذبات مچلتے ہیں اس لیے جس حد تک ہو سکے وہ خود کو چھپا لے، لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے اگر وہ نظر آتی رہی تو اس کا وجود معاشرے کے لیے خطرہ بنا رہے گا۔

ہمارے بڑوں نے دن رات کی محنت سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ وقت کو پیچھے دھکیلنے جیسا معجزہ بھی کر سکتے ہیں۔ اپنی بیٹیوں کو پر اعتماد، طاقت ور اور بااختیار بنانے کی بجائے ان کے گلے میں صدیوں پرانا طوق ڈال دیا جو ان کو آگے بڑھنے سے بچائے رکھے گا اور ہماری معاشرت کو لاحق خطرات ٹلے رہیں گے۔

پتہ نیں وہ کونسی اور کیسی دنیا ہے جہاں بچیوں اور عورتوں کی خودمختاری کی باتیں ہوتی ہیں۔ ان کو یہ حق دیا جاتا ہے وہ زندگی میں جو کرنا چاہیں کر سکتی ہیں۔ یہ ان کا انتخاب ہے کہ وہ جو پڑھنا چاہیں پڑھیں، عملی زندگی میں جس فیلڈ میں جانا چاہیں جائیں۔ اپنے لیے جیسے جیون ساتھی کا انتخاب کرنا چاہتی ہیں کریں۔ اور جو پہننا چاہتی ہیں پہنیں۔ آخر کو یہ ان کی اپنی زندگی ہے جس کے سارے فیصلے بھی انہی کو کرنے چاہیں۔

جب کوئی اپنی مرضی سے برقعہ پہننا چاہے تو اس پر اعتراض نہیں لیکن جب سرکارز بردستی ڈریس کوڈ تھوپنے کی کوشش کرے تو یہ قابل مذمت ہے۔ آپ عوام پر اپنی مرضی مسلط کر کے دنیا کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ آپ بنیادی انسانی حقوق کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں۔ ہم آج بھی اس فرسودہ نظام اور روایات پر فخر کرتے ہیں جن کو دنیا کب کی پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ ہم آج بھی اپنی عورتوں کے دماغ اور جسم وجان کے مالک ہیں اور دنیا کی روشن خیالی اور ترقی پسندانہ سوچ کی نفی کرتے ہیں۔ (بشکریہ ہم سب)

جہدحق پڑھنے والے توجہ کریں

- آپ نے اس شمارہ کا مطالعہ کیا۔

جو خامیاں/ کمزوریاں آپ کو نظر آئی ہوں۔ ان کی نشاندہی خط کے ذریعے سے کیجئے۔

- آپ بھی اپنے علاقے میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی رپورٹ/اطلاع ہمیں اس رسالہ میں چھپنے والا رپورٹ فارم پُر کر کے بذریعہ ڈاک روانہ کر سکتے ہیں۔ حقائق اچھی طرح سے تصدیق کر کے لکھیں۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک،

نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

HRCP کارکن متوجہ ہوں

''جہدحق'' کے لیے رپورٹ فارم کے مطابق کوائف پر مبنی رپورٹیں، خبریں، تصاویر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق دیگر مواد مہینے کے تیسرے ہفتہ تک پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مرکزی دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تا کہ یہ اگلے شمارے میں شائع کیا جا سکے۔

جہدحق کا تازہ شمارہ اور پچھلے شمارے نیچے دی گئی ویب سائٹ پر موجود ہیں

www.hrcp-web.org

مرنے کے بعد خواجہ سرا کا اپنی ماں کو خط

لینہ حاشر

ماں جی!

میری عمر نو دس برس کی تھی جب ابا نے مجھے زمین پر گھسیٹتے ہوئے گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ میں چیخ چیخ کر تمہیں پکارتا رہا مگر تم بے حس و حرکت سہمی ہوئی مجھے تکتی رہیں۔ واحد روانی تمہارے آنسوؤں کی تھی جو ابا کے غیض و غضب کے آگے بھی تھمنے کو تیار نہ تھے۔ تمہارا ہر آنسو اس بات کا ثبوت تھا کہ تم ابا کے اس فعل سے بہت نالاں تھی مگر ابا کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرنے پر مجبور بھی۔

محلے والوں کے طعنے، رشتے داروں کے طنز اور لوگوں کی چبھتی ہوئی نگاہوں سے جب ابا بے قابو ہو جاتے تو پھر اپنی کالے چمڑے کی چپل سے میری چمڑی ادھیڑتے۔ اپنے جسم پر چپل سے بنائے گئے نقش لیے میں اس کال کوٹھڑی کی جانب بھاگتا جو پورے گھر میں میری واحد پناہ گاہ بن گئی تھی۔ پٹائی کا دن جب رات میں ڈھلتا تو تم ابا سے چھپ کر دبے پاؤں آتیں۔ مجھے سینے سے لگاتی، اپنے دوپٹے سے میرے زخموں کی ٹکور کرتی۔ میرا سر اپنی گود میں لیے گھنٹوں میرے پاس بیٹھی رہتی۔ مجھے چپ کراتے کراتے تمہاری اپنی سسکیاں بندھ جاتیں۔ آہوں اور سسکیوں کی گونج کے علاوہ اس کال کوٹھڑی میں کچھ سنائی نہ دیتا۔ ہم دونوں آنسوؤں کی زبان میں بات کرتے۔ میرے آنسوؤں میں ان گنت سوال ہوتے۔ کہ آخر کیوں ابا کی نفرت کی خاص عنایت مجھ پر ہی ہے؟ آخر کیوں گھر میں مہمانوں کے آتے ہی اسٹور کے تنگ و تاریک کمرے میں گھر کے ہر فالتو سامان کے ساتھ مجھے بند کر دیا جاتا ہے اور جب تک اللہ کی رحمت ہمارے گھر سے چلی نہیں جاتی مجھے رہائی کا پروانہ کیوں نہیں دیا جاتا۔ یہ رحمت ہر بار میرے لیے زحمت کیوں بن جاتی ہے؟ مگر اماں میرے ہر سوال کے جواب میں تم خاموشی سے میرے اوپر محبت بھری نگاہ ڈالتی اور کچھ نہ بولتیں۔ بس کبھی تم میرے ماتھے کا بوسہ لیتی اور کبھی میرے ہاتھوں کو چوم کر اس بات کی گواہی دیتی کہ میں تو اپنے راجہ بیٹے سے بہت پیار کرتی ہوں۔ ایک سوال کرتے کرتے میں تھک جاتا اور نیند کی آغوش میں چلا جاتا کہ آخر میرے سے ایسی کیا خطا ہوئی جو میں اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی طرح ابا کے پیار کا حقدار نہیں۔

ہاں تمہاری گود میں سو جانے سے پہلے میں یہ دعا بھی کرتا کہ یہ رات کبھی ختم نہ ہو مگر صبح ہوتی اور تم پھر اس عورت کا لبادہ اوڑھ لیتی جو ابا اور معاشرے کے خوف سے مجھے پیار کرتے ڈرتی تھی۔

جس دن ابا نے مجھے گھر سے نکالا اس دن میرا قصور بس اتنا تھا کہ میں نے تمہاری سنگھار میز پر رکھی ہوئی لالی سے اپنے ہونٹ رنگ لیے تھے، تمہارا سرخ دوپٹہ سر پر رکھے، تمہارے ہاتھوں کے کنگن اپنی کلائی میں ڈالے تمہاری ٹک ٹک کرنے والی جوتی پہن کر خوش ہو رہا تھا، بس یہ دیکھنے کی دیر تھی کہ ابا نے مجھ پر پھر جوتوں کی برسات شروع کر دی۔ میں معافی کا طلب گار رہا مگر میری شنوائی نہ ہوئی اور پھر گالی گلوچ کرتے ہوئے زمین پر گھسیٹتے ہوئے زنخا زنخا کہتے ہوئے مجھے ہمیشہ کے لیے سب گھر والوں سے دور کر دیا۔

میرے لیے آبا کے آخری الفاظ یہ تھے کہ آج سے تو ہمارے لیے مر گیا۔ یہ جملہ سنتے ہی میری ہاتھوں کی گرفت جس نے ابا کے پیروں کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا کمزور پڑ گی۔ میری گڑگڑاتی ہوئی زبان خاموش ہو گی، میرے آنسو تھم گئے کیونکہ میں جانتا تھا کہ ابا اپنی کہی ہوئی بات سے کبھی نہیں پھرتے۔ اور تم ماں، ابا کے کسی بھی فیصلے کے خلاف جانے کی ہمت نہیں رکھتی

اس کے بعد ابا مجھے ہمیشہ کے لیے یہاں چھوڑ گئے جہاں ایک گرو رہتا تھا۔ امجد کی جگہ میرا نام علیشا رکھ دیا گیا۔ مجھے ناچ گانے کی تربیت دی جاتی۔ مجھ پر نظر رکھی جاتی لیکن میں جب کبھی موقع ملتا تمہاری محبت میں گرفتار اپنے گھر کی طرف دیوانہ وار بھاگتا مگر ابا کا آخری جملہ مجھے دہلیز پار کرنے سے روک دیتا۔ دروازے کی اوٹ سے جب تمہیں گرما گرم روٹی اتارتے دیکھتا تو میری بھوک بھی چمک جاتی اور پھر تم اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا بنا کر میرے بہن بھائیوں کے منہ میں ڈالتی تو ہر نوالے پر میرا بھی منہ کھلتا مگر وہ نوالے کی حسرت میں کھلا ہی رہتا۔ اس حسرت کو پورا کرنے کے لیے میں اکثر گھر کے باہر رکھی ہوئی سوکھی روٹی کو اپنے آنسوؤں میں بھگو بھگو کر کھاتا۔ بعد کی عیدیں تو تنہا ہی تھیں پر جب گھر بدر نہ ہوا تھا تب بھی عید پر جب ابا ہر ایک کے ہاتھ پر عیدی رکھتے تو میرا ہاتھ پھیلا ہی رہ جاتا۔ جب ہر بچے کی جھولی پیار اور محبت سے بھر دی جاتی تو میری جھولی خالی ہی رہ جاتی۔ جب ابا اپنا دست شفقت سب کے سروں پر پھیرتے تو میرا سر جھکا ہی رہتا۔

صحن میں کھڑی ابا کی سائیکل جس کو اکثر میں محلے سے گزرتے دیکھتا تو ہر بار دل میں یہ خواہش ہوتی کہ کاش ابا سائیکل روک کر مجھے ایک بار، صرف ایک بار سینے سے لگا لیں مگر میری یہ خواہش، خواہش ہی رہے گی۔ گھر چھوڑنے کے عذاب کے بعد میرے اوپر ایک اور عذاب نازل ہوا جس کے کرب نے میری روح تک کو زخمی کر دیا۔ چند 'شرفا' گرو کے پاس آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے زبردستی بے لباس کیا اور اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا ڈالا۔ ماں، میں اتنا چھوٹا اور کمزور تھا کہ میں تکلیف کی وجہ سے اپنے ہوش ہی کھو بیٹھا تھا۔ پھر اس ہی بے ہوشی کے عالم میں مجھے گرو کے حوالے کر دیا گیا۔ پھر یہ سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ میں روز ہی اپنی ہی نظروں میں گرتا رہا مرتا رہا۔ کرتا بھی کیا کہ اب میرے پاس کوئی اور دوسری پناہ گاہ نہ تھی۔

پھر اسی کام کو میرے گرو نے میرے پیشے کا نام دے دیا۔ میں گرو کے پاس سے کئی بار بھاگا، در در نوکری کی تلاش میں پھرتا رہا مگر مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ ہر بار گرو کے در پر ہی پناہ ملی۔

ہمارا وجود معاشرے میں گالی سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں تو کسی کو بددعا بھی دینی ہو تو ہم کہتے ہیں کہ جا تیرے گھر بھی مجھ جیسا پیدا ہو۔ حالانکہ ہماری رگوں میں بھی سرخ رنگ کا خون دوڑتا ہے۔ ہمیں بنانے والا بھی تو وہی ہے جس نے ان کو پیدا کیا۔ ان کے سینے میں بھی دل ہماری طرح ہی دھڑکتا ہے۔ تو پھر ہمیں کس بات کی سزا دی جاتی ہے؟ ہمارا جرم کیا ہوتا ہے؟ شاید ہمارا جرم یہ ہوتا ہے کہ ہمارا خون سرخ ہے اور معاشرے کا سفید۔

ماں میں ساری زندگی جینے کی چاہ میں مرتا چلا گیا۔ سفید خون رکھنے والے لوگ کبھی مذہب کی آڑ لے کر تو کبھی جسم فروشی سے انکار پر ہمارے جسموں میں گولیاں اتار دیتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، مجھے بھی گولیاں ماری گئیں۔ جب مجھے ہوش آیا تو ڈاکٹر مجھے امید کی کرن دکھانے کی کوشش میں آہستہ آہستہ میرے کان میں سرگوشی کر رہا تھا کہ اگر تم ہمت کرو تو زندگی کی طرف لوٹ سکتے ہو۔ میں نے بہت مشکل سے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی اور ڈاکٹر سے کہا کہ اگر میں ہمت کر کے لوٹ بھی آیا تو کیا مجھے جینے دیا جائے گا؟ جب ملک الموت میرے پاس آیا تو میں نے اس سے جینے کے لیے چند لمحوں کی درخواست کی۔ نجانے کیوں اس بار مجھے امید تھی کہ تم دوڑی چلی آؤ گی، میرا بچہ کہتے ہوئے مجھے اپنے سینے سے لگاؤ گی۔ میرے سر کو اپنی گود میں رکھ کر میرے زخموں کی ٹکور کر کے مجھے اس دنیا سے رخصت کرو گی۔ لیکن موت کے فرشتے نے چند لمحوں کی مہلت بھی نہ دی۔

سنا ہے قیامت کے روز بچوں کو ماں کے حوالے سے پکارا جائے گا۔ بس ماں تم سے اتنی سی التجا ہے کہ اس دن تم مجھ سے منہ نہ پھیرنا۔

تمہاری محبت کا طلبگار

تمہارا بیٹا

(بشکریہ ہم سب)

بچے کے ساتھ جنسی زیادتی

اقوام متحدہ کا کنونشن برائے اطفال (یو این سی آر سی) کا آرٹیکل 34 یہ تقاضا کرتا ہے کہ جسم فروشی اور عریانیت میں ملوث بچوں کو جنسی استحصال اور بدفعلی سے تحفظ دیا جائے۔ کنونشن کا اختیاری پروٹوکول بچوں کے جنسی استحصال اور زیادتی کے خاتمے کے لیے ممالک کو مکمل تفصیلات فراہم کرتا ہے اور بچوں کی فروخت، بچہ جسم فروشی اور بچہ عریانیت کے معاملات پر کنونشن کو تقویت دیتا ہے۔ یہ پروٹوکول ''بچہ عریانیت''، ''بچہ جسم فروشی'' اور ''بچوں کی فروخت'' کے جرائم کی تعریف بھی پیش کرتا ہے۔ مزید برآں پروٹوکول بچوں کا جنسی استحصال کرنے والوں، بچوں کے جسمانی اعضاء کا کاروبار کرنے والوں اور بچوں سے مشقت کروانے کی خاطر انہیں جبری طور پر منتقل کرنے والے افراد کے خلاف سزا کا مطالبہ کرتا ہے۔

بچوں سے بدفعلی کیا ہے؟

بالغ افراد کا بچوں پر رعب و دبدبہ ہوتا ہے اور بچے بڑوں پر اعتماد کرتے ہیں۔ جب کوئی بالغ فرد بچے کا اعتماد مجروح کرتا ہے اور بچے یا بچی کو کسی جنسی فعل میں ملوث کرنے کے لیے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتا ہے تو اس امر کو ''بچے سے جنسی بدفعلی'' کہا جاتا ہے۔ جنسی بدفعلی کے اکثر واقعات میں مرتکب افراد بچے کے واقف کار ہوتے ہیں اور بعض اوقات ایسے واقعات میں خاندان کے افراد بھی ملوث ہوتے ہیں۔ جنسی بدفعلی کا ارتکاب کرنے والوں میں مرد وخواتین دونوں شامل ہوتے ہیں اور اس کا شکار ہونے والوں میں بلاتفریق صنف، لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں۔

بچے سے بدفعلی میں شہوت نظر (بچوں کو ننگا دیکھ کر لطف اندوز ہونا)، کسی بچے کے جنسی اعضا کی نمائش سے مسحور ہونا، بچے کو جنسی افعال میں ملوث کرنا، بوسہ بازی یا جنسی مقاصد کے لیے بچے کو چھونا، بچے کے جنسی اعضاء کو چھونا، بچے کو بدفعلی کے مرتکب فرد کے جنسی اعضاء کو چھونے پر مجبور کرنا، مشت زنی، دخول اور بچے کو جسم فروشی اور عریانیت کے لیے استعمال کرنے کے اقدامات شامل ہیں۔

بچے کے جنسی بدفعلی کا شکار ہونے کی نشانیاں

بچوں سے بدفعلی کے مسئلے پر جاری سماجی خاموشی کی وجہ سے بچے کے رویے یا جسمانی حرکات کے مشاہدے کے ذریعے صرف بچے کے جنسی بدفعلی کا شکار ہونے سے متعلق قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔ مزید برآں ان نشانیوں سے بدسلوکی کی دوسری اقسام مثلاً جسمانی اور جذباتی بدسلوکی کے بارے میں بھی پتہ چل سکتا ہے۔

رویے کے بعض ممکن اشاریے:

☆ علیحدگی، تنہائی، اندھیرے سے یا کسی فرد کا خوف
☆ سونے میں مشکلات یا ڈراؤنے خواب
☆ پسپائی یا تنہائی
☆ عزتِ نفس کا مجروح ہونا
☆ موڈ اور رویے میں اچانک تبدیلیاں
☆ بے جا جارحیت
☆ اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کے رجحانات مثلاً منشیات کا استعمال اور شراب نوشی، کھانے پینے میں بدنظمی، خودکشی وغیرہ
☆ جنسی بے راہ روی
☆ سکول میں ناقص کارکردگی

بعض ممکنہ جسمانی اشاریے:

☆ چلنے اور بیٹھنے میں مشکلات
☆ اعضائے تناسل میں بے وجہ درد ہونا
☆ خارش، سوجن، رطوبت کا بہنا یا عضو تناسل یا شرم گاہ سے بلا وجہ خون بہنا
☆ پیشاب کی نالی میں بار بار انفیکشنز ہونا
جنسی فعل سے منتقل ہونے والی بیماریاں
☆ جسم پر خراشیں، کاٹنے کے نشان یا دیگر اقسام کے زخم

بچوں سے جنسی بدفعلی کے اثرات:

بچے سے بدفعلی کے طور پر اور طویل المعیاد اثرات نہ صرف فرد بلکہ خاندان اور معاشرے پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ بچے پر ہونے والے فوری اثرات میں جسمانی اور جذباتی (غصہ، احساسِ جرم اور ندامت) اثرات شامل ہیں۔

بچے کے بالغ ہونے پر طویل المعیاد اثرات:

☆ بے تکلف تعلقات بنانے اور برقرار رکھنے میں مشکلات
☆ ازدواجی مسائل
☆ تنہائی پسند
☆ حالت افسردگی میں رہنا
☆ مزید بدفعلی اور استحصال کے خدشات
☆ جسم فروشی میں ملوث ہو جانا
☆ منشیات، شراب اور خوراک کا غلط استعمال
☆ بدفعلی کا مرتکب بننے کا خطرہ

مفروضے اور حقائق

مفروضہ: جنسی بدفعلی عموماً گھر سے باہر ہوتی ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والے اجنبی ہوتے ہیں۔

حقیقت: زیادہ تر بچوں کے ساتھ جنسی بدفعلی گھروں کے اندر ہوتی ہے اور ان واقعات میں ملوث کثیر تعداد ایسے افراد کی ہوتی ہے جنہیں بچوں اور ان کے خاندان کا اعتماد حاصل ہوتا ہے۔

مفروضہ: بچوں سے جنسی بدفعلی کے واقعات رپورٹ کرنے سے بہتری کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔

حقیقت: بچے سے جنسی بدفعلی کا واقعہ اگر درج نہ کرایا جائے تو وہی ملزم دوسرے بچوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے یا اسی بچے کو دوبارہ بدفعلی کا نشانہ بنا سکتا ہے۔

جنسی بدفعلی کے امکان پر بچوں سے تبادلہ خیال

خاندان کے بڑے ہر وقت بچوں کو تحفظ فراہم نہیں کر سکتے۔ بچوں کو بذات خود حفاظتی تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہر بچے کو اس حقیقت سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے کہ بچوں سے جنسی بدفعلی کی لعنت موجود ہے اور وہ بھی اس کا شکار ہو سکتا ہے۔

1۔ بچوں کو بتائیں کہ ان کے جسم ان کی ملکیت ہیں اور اگر کوئی بھی ان کے جسم کو اس انداز سے چھوئے کہ وہ بوکھلا جائیں یا خوفزدہ ہو جائیں تو انہیں فوری طور پر کسی بڑے اور بااعتماد فرد کو بتانا چاہیے۔
2۔ بچوں کو بتائیں کہ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انہیں غلط انداز میں چھوئے، بوسہ دے یا گلے لگائے۔ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت ہے جس پر انہیں فوری طور پر کسی بااعتماد شخص کو آگاہ کرنا چاہیے۔
3۔ بچوں کو بتائیں کہ اگر کوئی انہیں پیسے یا ٹافیاں دیتا ہے تو وہ اس بات کو مت چھپائیں اور نہ ہی اس کے عوض وہ یہ چیزیں دینے والے کی کوئی بات مانیں۔
4۔ بچوں کو بتائیں کہ اگر ان کے ساتھ بدفعلی کا واقعہ ہو جائے تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔

جب بچہ بدفعلی کے بارے میں بتائے تو کیا کریں؟

پہلا ردعمل شاید غصے، بے یقینی، صدمے اور نفرت کا اظہار ہوگا۔ ان حالات میں پرسکون رہنا بہت اہم ہے اور جذبات کو بچے پر ظاہر نہ ہونے دیں کیونکہ اس طرح بچہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے بارے میں مزید گفتگو ترک کر سکتا ہے۔ نتیجتاً بچہ احساس جرم اور شرمندگی کے احساسات سے مغلوب ہو سکتا ہے۔

☆ بچے یا بچی کو بتائیں کہ آپ اس کی بات پر یقین کرتے ہیں۔
☆ بچے یا بچی پر واضح کریں کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔
☆ بچے یا بچی کو بتائیں کہ اس نے آپ کو یا کسی بڑے کو بتا کر درست اقدام کیا ہے۔
☆ بچے یا بچی کو تسلی دینے کے لیے جو کچھ ممکن ہو وہ کریں۔ مزید برآں بچے سے ایسا کوئی وعدہ نہ کریں جو پورا نہ ہو سکے۔

اگر بچے یا بچی نے آپ کے سامنے بدفعلی کا شکار ہونے کا انکشاف کیا ہے تو وہ آپ کی مدد کے طلب گار ہیں۔ اگر آپ لائحہ عمل کے بارے میں بے یقینی میں مبتلا ہیں تو کسی سے مشورہ کر لیں۔

میں کیا کر سکتا ہوں؟

بچے سے جنسی بدفعلی کے بارے میں آگاہی ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ ذیل میں چند طریقے درج ہیں جن پر عمل کر کے بچوں کو تحفظ فراہم کرنے میں آپ اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں:۔

1۔ باخبر رہیں۔
2۔ بچے سے جنسی بدفعلی کے بارے میں دوستوں اور افراد خانہ کو بتائیں۔
3۔ بچے سے جنسی بدفعلی کے موضوع پر بچوں سے بات کریں۔ محفوظ اور غیر محفوظ لمس کے بارے میں اپنے بچوں کو بتائیں۔
4۔ بچوں کے جنسی استحصال کے خلاف اپنی آواز بلند کریں۔
5۔ بچے سے جنسی بدفعلی کے موضوع پر اخبارات اور جرائد میں لکھیں۔

(بشکریہ سپارک)

بلوچستان یونیورسٹی: 'طالبات ہراسانی کیس میں جو دعوے سامنے آئے ہیں خدا کرے وہ درست نہ ہوں

پاکستان میں صوبہ بلوچستان کی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جمال خان مندوخیل نے کہا ہے کہ یونیورسٹی آف بلوچستان میں ہراسانی کے حوالے سے جو دعوے سامنے آئے ہیں وہ خدا کرے کہ درست نہ ہوں کیونکہ اگر وہ درست ہوئے تو پھر ہم اس قابل نہیں کہ انسان کہلوائیں۔

چیف جسٹس نے کہا کہ ایسی باتیں بھی سامنے آئی ہیں کہ 'اے گریڈ چاہیے یا فیل ہونا ہے، سکالرشپ پر آسٹریلیا جانا ہے یا امریکہ جانا ہے یا کہیں نہیں جانا۔'

جسٹس جمال خان مندوخیل نے کہا کہ ہم سب نے مل کر دو کام کرنے ہیں ایک یہ کہ یونیورسٹی کی ساکھ بحال ہو اور دوسرا یہ کہ جو لوگ ہراسانی کے واقعات میں ملوث رہے ہیں ان کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ یہ ریمارکس انھوں نے یونیورسٹی میں طالبات کو مبینہ طور پر ہراساں کرنے سے متعلق کیس کی سماعت کے دوران دیے۔

کیس کی سماعت چیف جسٹس کی سربراہی میں قائم دو رکنی ڈویژنل بینچ نے کی۔

سماعت کے موقع پر بلوچستان اسمبلی کے پارلیمانی کمیٹی کے اراکین، یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر محمد انور پانیزئی، ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے نمائندوں کے علاوہ وکلا کی بہت بڑی تعداد کمرہ عدالت میں موجود تھی۔

سماعت کے دوران ایف آئی اے کے حکام نے ایک مرتبہ پھر یونیورسٹی میں خفیہ کیمروں کے استعمال کے حوالے سے ایک رپورٹ اس درخواست کے ساتھ پیش کی کہ تحقیقات مکمل ہونے تک اسے افشاں نہ کیا جائے، تاہم چیف جسٹس نے ایف آئی اے کی رپورٹ سے بلوچستان اسمبلی کے اراکین کو آگاہ کرنے کے لیے انھیں اپنے چیمبر میں طلب کیا۔

قائم مقام وائس چانسلر کی بے بسی

سماعت کے دوران جب چیف جسٹس نے قائم مقام وائس چانسلر سے کہا کہ وہ قانون کی مطابق کارروائی کریں تو وہ اپنی بے بسی کا اظہار کرتے رہے۔

چیف جسٹس نے انھیں کہا کہ قانون کے تحت انہیں ہراسانی سے متعلق معاملات کی تحقیقات اور اس کے ذمہ دار افراد کے خلاف کارروائی کا مکمل اختیار ہے۔ انھوں نے وائس چانسلر کو کہا کہ اگر وہ قانون کے مطابق کارروائی نہیں کر سکتے تو وہ اپنا عہدہ چھوڑ دیں۔

بلوچستان اسمبلی کے اراکین نے کیا کہا؟

بلوچستان اسمبلی کی تحقیقاتی کمیٹی کے اراکین چیئرپرسن مہ جبین شیران کی قیادت میں پیش ہوئے۔

چیئرپرسن نے کہا کہ انہیں ہراسانی کے حوالے سے بہت ساری شکایتیں فون اور واٹس ایپ پر موصول ہوئیں لیکن متاثرین میں سے تاحال کوئی بھی کمیٹی کے سامنے پیش نہیں ہوا۔

کمیٹی کے رکن ثنا بلوچ نے کہا کہ یونیورسٹی میں بڑی تعداد میں سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہیں لیکن ان کو استعمال کے حوالے سے کوئی سٹینڈرڈ آپریٹنگ پروسیجر نہیں ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ یونیورسٹی میں جو لوگ سکیورٹی یا سی سی ٹی وی کو آپریٹ کرنے پر معمور ہیں ان کی اخلاقی اور ہماری سماجی اقدار کے حوالے سے تربیت ہونی چاہیے۔

انہوں نے کہا کہ اس وقت لوگوں کی نگاہیں عدلیہ، بلوچستان اسمبلی اور ایف آئی اے پر لگی ہوئی ہیں۔

اسمبلی کی رکن شکیلہ نوید نے عدالت کو آگاہ کیا کہ کچھ عرصہ بیشتر سکیورٹی اہلکار گرلز ہاسٹل میں رات کو آئے اور وہاں کمرہ نمبر دو کو خالی کرایا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہاسٹل میں لڑکیاں چیختی رہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور رات کو یہ لوگ کیوں آئے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ جب کمیٹی کے اراکین نے ہاسٹل کے چوکیدار سے پوچھا کہ انھوں نے سکیورٹی اہلکاروں کو کیوں چھوڑا تو ان کا جواب یہ تھا کہ وہ ہاسٹل کے دروازے سے نہیں آئے بلکہ سیڑھیاں لگا کر اندر داخل ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ اس کی ویڈیو بھی ہے جسے وہ چیمبر میں فاضل ججوں کو دکھائیں گی۔

اس بات پر چیف جسٹس نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے وائس چانسلر سے کہا کہ سکیورٹی اہلکار وہاں حفاظت کے لیے ہیں یا لوگوں کو ہراساں کرنے کے لیے؟

ہیومن رائٹس کمیشن کے نمائندے نے کیا کہا؟

ہراسانی کی خبروں کے بعد ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے اراکین نے بھی یونیورسٹی کا دورہ کیا تھا۔

کمیشن کے بلوچستان چیپٹر کے سربراہ حبیب طاہر ایڈووکیٹ نے بتایا کہ کمیشن کے اراکین نے نہ صرف اب یونیورسٹی کا دورہ کیا ہے بلکہ اس سے پہلے بھی ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے بھی یونیورسٹی کے امور کا جائزہ لیا تھا۔

انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی کے اندر فرنٹیئر کور کے اہلکاروں کی ایک بڑی تعداد تعینات ہے۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا گھر، جمنازیم اور ایک ٹیچرز ہاسٹل بھی ایف سی کے استعمال میں ہے۔

انھوں نے کہا کہ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ یونیورسٹی کی اپنی سیکیورٹی کافی ہے اس لیے ایف سی کے اہلکاروں کی یونیورسٹی کے اندر تعیناتی کی ضرورت نہیں ہے۔

اس موقع پر ایک خاتون وکیل جمیلہ ایڈووکیٹ نے عدالت کو بتایا کہ ایف سی کے اہلکاروں نے یونیورسٹی کے اندر ایک تفتیشی مرکز بھی بنایا ہے جہاں وہ باہر سے لوگوں کو گرفتار کر کے تفتیش کے لیے لاتے ہیں۔ چیف جسٹس نے اس پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے وائس چانسلر کو ہدایت کی کہ وہ جمنازیم، ٹیچرز ہاسٹل اور وائس چانسلر کے گھر کو دو دن کے اندر ایف سی کے اہلکاروں سے خالی کرائیں۔

ہراسانی سے متاثرہ کوئی شخص ایف آئی اے پیش نہیں ہوا

بلوچستان کے قبائلی ماحول کی وجہ سے ہراسانی سے متاثرہ کوئی بھی خاتون ایف آئی اے میں کیس رجسٹر کرانے کے لیے سامنے نہیں

آئی جس پر عدالت کے کہنے پر ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل بلوچستان شہک بلوچ شکایت کنندہ بننے تھے۔

انہوں نے سماعت کے دوران بھی ہراسانی کے ایک کیس کا حوالہ دیا۔ انھوں نے عدالت کو بتایا کہ 'ایک ڈیپارٹمنٹ کی طالبہ کو اس کے ایک ٹیچر نے کہا کہ آپ کا سمسٹر ڈراپ ہو رہا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس کو ڈراپ نہیں ہونے دوں گا۔ اس طالبہ کو اس کے ڈیپارٹمنٹ کے دو ٹیچروں نے تین گھنٹے تک اپنے پاس بٹھائے رکھا۔' انھوں نے کہا کہ ہراسانی کے حوالے سے اب تک یونیورسٹی کے چھوٹے گریڈ کے چار اہلکاروں کو معطل کیا گیا لیکن معاملے کو اس سے آگے کیوں نہیں بڑھایا گیا۔ انھوں نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ کل ایف آئی اے والے آئیں گے اور یہ بتائیں گے کہ متاثرین میں سے کوئی سامنے نہیں آیا اس لیے کسی کے خلاف کارروائی نہیں کی جا سکتی۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتائیں گے کہ آئندہ ایسے واقعات سے بچنے کے لیے فلاں فلاں گائیڈ لائنز پر عملدرآمد کیا جائے۔ تاہم چیف جسٹس نے کہا کہ عدالت ایسا نہیں ہونے دے گی کیونکہ یہ معاملہ نہ صرف اس بینچ کے اراکین دیکھ رہے ہیں بلکہ عدالت کے تمام جج اس کی مانیٹرنگ کر رہے ہیں۔ چیف جسٹس نے وائس چانسلر اور ایف آئی اے کے حکام کو کہا کہ 'جو بھی ان واقعات میں ملوث ہو ان کے خلاف بلا امتیاز کارروائی کریں خواہ اس میں میں خود (چیف جسٹس) ہی کیوں نہ ہوں۔' انھوں نے کہا کہ متاثرین کو ایف آئی اے یا بلوچستان اسمبلی کی کمیٹی کے سامنے پیش ہونا چاہیے تاکہ ان واقعات میں ملوث عناصر کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔

عدالت نے کیا احکامات دیے؟

عدالت نے کیس کی سماعت 15 دن بعد تک ملتوی کرتے ہوئے ایف آئی اے کے حکام کو حکم دیا کہ وہ اپنی تحقیقات جاری رکھیں۔ عدالت نے وائس چانسلر کو حکم دیا کہ وہ یونیورسٹی کی جمنازیم، وائس چانسلر کے گھر اور ٹیچرز ہاسٹل سمیت ان تمام مقامات کو ایف سی اہلکاروں سے خالی کرائیں جو کہ طلبا اور اساتذہ کے لیے مختص ہیں۔

عدالت نے کہا کہ کیس کی سماعت کے دوران یہ دلائل بھی سامنے آئے کہ یونیورسٹی کے اندر فرنٹیئر کور کی ضرورت نہیں۔

عدالت نے کہا کہ چیف سیکریٹری، وائس چانسلر، ایڈیشنل چیف سیکریٹری ہوم اور ڈپٹی کمشنر کوئٹہ کو اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ اگر ایف سی کی ضرورت ہے تو ان کے لیے یونیورسٹی کے باہر کون سی جگہ مختص ہونی چاہیے۔ (بشکریہ بی بی سی اردو)

پاکستان میں 5 برس کے دوران 33 صحافی قتل کر دیے گئے

اسلام آباد فریڈم نیٹ ورک کی جانب سے کہا گیا ہے کہ پاکستان بھر میں 6 برس میں صحافتی ذمہ داریاں نبھانے کے دوران 33 صحافیوں کو قتل کیا گیا جبکہ گزشتہ برس نومبر سے رواں سال اکتوبر کے دوران 7 صحافی قتل ہوئے۔

ڈان اخبار کی رپورٹ کے مطابق فریڈم نیٹ ورک کی جانب سے پاکستان میں قتل کیے جانے والے صحافیوں اور ان کے قاتلوں کو سزا نہ ہونے سے متعلق جاری کی گئی حالیہ رپورٹ میں 'پاکستان امپیونٹی اسکور کارڈ' بھی جاری کیا گیا ہے جس کے اعداد و شمار انتہائی ہولناک ہیں۔

یہ رپورٹ صحافیوں کے خلاف جرائم ختم کرنے کے عالمی دن کی مناسبت سے شائع کی گئی ہے، جو اقوام متحدہ کی جانب سے ہر سال ر 2 نومبر کو منایا جاتا ہے۔

پاکستان امپیونٹی اسکور کارڈ کے مطابق 2013 سے 2019 کے درمیان 33 صحافیوں میں سے 32 کے قتل کی ایف آئی آر درج کی گئی جس میں پولیس صرف 20 کیسز یا 60 فیصد کیسز میں چارج شیٹ جمع کرا سکی۔

رپورٹ کے مطابق 33 مقدمات میں سے عدالتوں نے صرف 20 کیسز کو ٹرائل کے لیے موضوع قرار دیا جبکہ ان میں سے صرف 6 مقدمات یعنی 18 فیصد میں پروسیکیوشن اور ٹرائل مکمل ہوا۔

جن 6 مقدمات کا ٹرائل مکمل ہوا ان میں سے صرف ایک میں قاتل کو سزا ہوئی لیکن وہ بھی اپیل دائر کرنے کے بعد سزا سے بچنے میں کامیاب ہوگیا جس کے بعد مقتول صحافی کے اہلِ خانہ وسائل کی کمی کے باعث انصاف کے حصول سے پیچھے ہٹ گئے۔

مذکورہ اعداد و شمار میں وہ 7 صحافی بھی شامل ہیں جنہیں

نومبر 2018 سے اکتوبر 2019 کے درمیان قتل کیا گیا۔

رپورٹ کے مطابق تمام 7 مقدمات کی ایف آئی آر درج کی گئی تھی لیکن صرف 4 کیسز میں پولیس نے چارج شیٹ فائل کی تھی۔

ان تمام 7 مقدمات میں سے کوئی ایک بھی کسی ایسے مرحلے تک نہیں پہنچ سکا جہاں عدالتیں کوئی فیصلہ سناتیں یا انصاف فراہم کرتیں۔

فریڈم نیٹ ورک کے مطابق پاکستان کا شمار صحافیوں کے قاتلوں کو زیادہ استثنیٰ دینے والے ممالک میں ہوتا ہے۔

آزادی صحافت اور آزادی اظہار رائے کا دفاع کرنے والی تنظیم نے کہا کہ ان کی رپورٹ قاتلوں کو دیے گئے خصوصی استثنیٰ پر مبنی ہے اور اس میں صحافیوں کے قتل کی ایف آئی آر، ان کے اہلِ خانہ، وکلا اور ساتھیوں کے انکشافات بھی بیان کیے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں انٹرنیشنل پریس انسٹیٹیوٹ (آئی پی آئی) نے صحافیوں کے خلاف جرائم ختم کرنے کے عالمی دن کی مناسبت سے جاری بیان میں کہا کہ دنیا بھر کی جمہوریتیں صحافیوں کے تحفظ، ان کے خلاف جرائم اور قتل کی تحقیقات میں ناکام ہو رہی ہیں۔

آئی پی آئی کی ڈیتھ واچ کے مطابق گزشتہ برس 40 صحافی جان کی بازی ہار گئے، جن میں سے 25 کو کرپشن یا جرائم سے متعلق سرگرمیاں بے نقاب کرنے کے جواب میں نشانہ بنایا گیا۔

ڈیتھ واچ کے مطابق افغانستان، شام اور یمن میں 8 صحافی تنازعات کی کوریج کے دوران جبکہ ایک سول تنازع کی کوریج کے دوران ہلاک ہوا۔

علاوہ ازیں 6 صحافی کام کے دوران ہلاک ہوئے جن میں سے 2 صومالیہ میں جبکہ برازیل، ترکی، برطانیہ اور امریکا میں ایک ایک صحافی قتل ہوا۔

واضح رہے کہ امریکا میں سب سے زیادہ صحافیوں کو نشانہ بنایا گیا جہاں 18 صحافی قتل ہوئے۔

ڈیتھ واچ کے اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ برسوں میں اکثر صحافیوں کو جمہوری نظام حکومت کے درمیان نشانہ بنایا گیا اور ان ممالک میں ایسے جرائم کو استثنیٰ دیے جانے کی شرح بھی زیادہ ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان)

☆☆☆

نامعلوم مسلح شخص کی فائرنگ سے 2 خواجہ سراء زخمی

کوہاٹ زیکم اکتوبر 2019ء کو کوہاٹ میں دو خواجہ سراؤں کو فائرنگ کر کے زخمی کر دیا گیا ہے۔ پولیس نے مجروح خواجہ سراء کی مدعیت میں نامعلوم شخص کے خلاف مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی ہے۔ گزشتہ شام کوہاٹ میں مقیم دو خواجہ سراؤں حمداللہ ولد عبداللہ سکنہ مردان اور افغان مہاجر فرمان ولد نصرت خان پر نامعلوم مسلح شخص نے اس وقت اچانک فائرنگ کر دی جب وہ کوہاٹ ہنگو روڈ پر واقع شمع مارکیٹ کے اندر رکشہ سے اتر کر اپنے رہائشی ڈیرے پر جا رہے تھے۔ فائرنگ کے نتیجے میں دونوں خواجہ سراء زخمی ہوگئے جنہیں فوری طور پر کوہاٹ ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کے ڈی اے ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔

(روزنامہ آج)

بیوی کے قتل کی کوشش

پشاور 8 اکتوبر 2019ء کو پہاڑی پورہ پولیس نے بروقت کاروائی کرتے ہوئے سورہ کے تنازعہ پر شوہر کے ہاتھوں بیوی کو قتل کرنے کی کوشش ناکام بنادی۔ ملزم پولیس کو دیکھتے ہی فرار ہوگیا۔ پولیس نے پستول برآمد کر کے مقدمہ درج کر لیا۔ واقعے کی تفصیلات کے مطابق ذکیہ زوجہ سردار سکنہ سیٹھی ٹاؤن اپنے گھر میں موجود تھی کہ اس دوران اس کا شوہر سردار نواز کے ساتھ بیٹی نگینہ کا رشتہ سورہ میں دینے کے تنازعہ پر تکرار ہوئی جس پر شوہر نے اسے کمرے میں بند کر دیا جبکہ بیٹی نگینہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی اور فوری پولیس کو اطلاع دی جس پر پولیس موقع پر پہنچ گئی اور اس کی جان بچالی جبکہ ملزم فرار ہوگیا۔ پولیس نے مقدمہ درج کر کے مزید تفتیش شروع کر دی ہے۔

(روزنامہ آج)

شوہر پر جنسی وجسمانی تشدد کا الزام

ٹوبہ ٹیک سنگھ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نواحی گاؤں 667/7 گ ب میں خاتون کو تشدد کا نشانہ بنانے والے شوہر اور بااثر زمیندار کے خلاف مقدمہ درج کرلیا گیا خاتون نے الزام عائد کیا تھا کہ اس کا شوہر کاظم اسے بااثر زمیندار محمد طفیل سے ناجائز تعلقات قائم کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ تاہم اس کے انکار پر شوہر اور بااثر زمیندار نے مل کر مجھے نہ صرف زیادتی کا نشانہ بنایا بلکہ شدید تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد گھر سے نکال دیا۔ اہل علاقہ نے شورش کر متاثرہ خاتون کو طبی امداد کے لیے ٹی ایچ کیو ہسپتال پیر محل پہنچایا جہاں اسے طبی امداد فراہم کی گئی۔ دوسری جانب ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر وقار شعیب قریشی نے خاتون کی درخواست پر نوٹس لیتے ہوئے ملزمان کے خلاف مقدمہ درج کرکیاس کی گرفتاری کا حکم دیا ہے۔ مقدمہ درج ہونے کے بعد ملزمان فرار ہوگئے ہیں تاہم ابھی تک کسی ملزم کی گرفتاری عمل میں نہیں سکی ہے۔ ملزمان کے خلاف مقدمے میں زیادتی اور تشدد کی دفعات شامل کی گئیں۔

(اعجاز اقبال)

پسند کی شادی کرنے والا جوڑا پر قتل

پشاور 6 اکتوبر 2019ء کو تھانہ چمکنی کے علاقہ جھگڑا میں گھر سے بھاگ کر شادی کرنیوالے جوڑے کو غیرت کے نام پر قتل کرکے نعشیں دریائے باڑہ میں پھینک دی گئیں۔ پولیس نے نعشیں قبضے میں لیکر پوسٹ مارٹم کیلئے مردہ خانہ منتقل کردیں، مقتولین کو چند روز قبل اپنے خاندان والوں نے صلح کے بہانے گھر واپس بلالیا تھا اور اتوار کے روز دونوں کی قتل شدہ نعشیں برآمد ہوگئیں۔ پولیس نے مقتولین کے لواحقین کی جانب سے رپورٹ درج نہ کرائے جانے پر اپنی مدعیت میں مقدمہ درج کرلیا ہے۔ پولیس کے مطابق اتوار کی صبح تھانہ چمکنی کی حدود میں دریائے باڑہ کے علاقہ جھگڑا سے ایک لڑکے اور ایک جوان لڑکی کی نعشیں برآمد ہوئی جن کو فائرنگ کرکے قتل کیا گیا تھا۔ بعدازاں لڑکے کی شناخت جواد ولد فاروق جبکہ لڑکی کی شناخت دختر مجاہد ساکنان خالق آباد چمکنی کے نام سے ہوئی۔ پولیس کے مطابق مرد سوزوکی ڈرائیور تھا اور لڑکی لائبہ مقامی کالج میں پڑھتی تھی جو اداسے روزانہ کالج لیکر جاتا تھا اور اسی طرح ان کی دوستی ہوئی جو محبت میں بدل گئی۔ لڑکی کے خاندان والوں نے بعد میں ان کو منالیا اور اس واقعے کے سات مہینے گزر چکے تھے۔ گزشتہ روز پولیس کو ان دونوں کی تشدد زدہ لاشیں ملیں جنہیں پولیس نے تحویل میں لیکر پوسٹ مارٹم کیلئے ہسپتال منتقل کردیا۔

(روزنامہ آج)

کال کوٹھڑی میں قید نوجوان پاکستانی اسکالر جسے دنیا نے بھلا دیا

ملتان فل برائیٹ اسکالر جنید حفیظ چھ سال سے پاکستان کی ایک جیل میں قید تنہائی کاٹ رہے ہیں۔ ان پر توہین مذہب کا الزام ہے جس سے وہ اور ان کے گھر والے مسلسل انکار کرتے آئے ہیں۔ جنید حفیظ کا تعلق پنجاب کے شہر راجن پور سے ہے۔ وہ دو ہزار دس میں امریکا کی جیکسن اسٹیٹ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بڑے شوق سے واپس پاکستان آئے۔ ملتان کی بہاالدین ذکریا یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے لیکچرار کی اسامی آئی تو انہوں نے بھی درخواست جمع کرادی۔ اُس وقت انہیں یونیورسٹی کی اندرونی سیاست کا اندازہ نہ تھا۔ جنید کے والد حفیظ النصیر کے مطابق اسلامی جمعیت طلبا سے وابستہ لڑکوں نے انہیں اس اسامی کے لیے درخواست دینے سے منع کیا تھا کیونکہ بقول ان کے، وہ اپنے کسی بندے کو وہاں لگوانا چاہتے تھے۔ حفیظ النصیر کے مطابق، "جنید کے باز نہ آنے پر سن دو ہزار تیرہ میں انہوں نے میرے بیٹے کے خلاف مذموم مہم چلائی، اُس کے خلاف پمفلٹ بانٹے، اُس پر توہینِ مذہب کا الزام لگایا، اُسے احمدی اور امریکی ایجنٹ قرار دیا۔" مذہبی جنون کے دباؤ کے سامنے حکومت بے بس نظر آئی اور پولیس نے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ فل برائیٹ اسکالر کو سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا۔ اگر ان پر الزام ثابت ہوتا ہے تو انہیں سزائے موت ہوسکتی ہے۔ توہین مذہب کے قوانین پاکستان کو برطانوی حکمرانوں سے ورثے میں ملے۔ لیکن جنرل ضیاء کے دور میں ان میں نئی روح پھونک دی گئی۔ سزائیں سخت کی گئیں اور "اسلامائیزیشن" کے نعرے کے تحت قانون کے غلط اور بے دریغ استعمال کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ پچھلے تیس برسوں میں اس متنازعہ قانون کے تحت پاکستان میں ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ مقدمات درج ہوئے ہیں، جبکہ درجنوں لوگوں کو محض الزام کی بنیاد پر ہی قتل کردیا گیا۔ انسانی حقوق کی تنظیموں کے مطابق، پاکستان میں کسی پر توہین مذہب اور توہین رسالت کا الزام ہی ایک طرح کا "ڈیتھ وارنٹ" ہوتا ہے کیونکہ اس کے بعد ملزمان کی جان کو ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔

(بشکریہ ڈی ڈبلیو)

طالبعلم کی نعش کھیتوں سے برآمد

چارسدہ 5 اکتوبر 2019ء کو ہائی سکول محمد ناڑی کے جماعت ششم کے بارہ سالہ طالب علم کی برہنہ ذبح شدہ نعش عظیم خان پل میں کھیتوں سے برآمد ہوئی۔ تھانہ خانمائی کے علاقے عظیم خان قلعہ میں جماعت ششم کے 12 سالہ طالب علم سراج ولد شوکت مرحوم کی نعش گزشتہ روز کھیتوں سے برآمد ہوئی، اہل علاقہ کے مطابق کمسن طالب علم ایک روز قبل گھاس کاٹنے کیلئے گھر سے نکلا اور واپس نہیں آیا جس کے بعد اس کی نعش عظیم خان قلعہ میں کھیتوں سے برآمد ہوئی۔ اہل علاقہ کے مطابق مقتول بچے کے والد شوکت بھی ایک سال قبل نامعلوم افراد کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ مقتول سراج کی والدہ محنت مزدوری کرکے اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔ مقتول گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری سکول محمد ناڑی میں ششم جماعت کا طالب علم تھا۔ اہل علاقہ نے مقتول سراج کے بہیمانہ قتل کی شدید مذمت کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ سراج کے قاتلوں کو جلد از جلد گرفتار کرکے سزا دی جائے، ایم این اے فضل محمد خان نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر خانمائی پولیس کو اندوہناک قتل میں ملوث ملزمان کی جلد از جلد گرفتاری اور سزا دینے کا مطالبہ کیا ہے۔

(نامہ نگار)

4 سالہ بچی کو ونی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا

ڈیرہ اسماعیل خان 17 اکتوبر 2019ء کو تحصیل پہاڑ پور کے علاقہ جھوک عمرے والی میں پنچائیت نے 4 سالہ معصوم بچی کو ظالمانہ رسم ونی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ معصوم بچی کا نکاح 22 سالہ نوجوان کے ساتھ کرنے کی اطلاع پر پولیس حرکت میں آگئی۔ بچی کے والد کی رپورٹ پر نکاح خواہ سمیت 7 افراد کے خلاف مقدمہ درج کرلیا گیا۔ عمرے والی کے رہائشی زبیر ولد غلام سرور کے حنیف الرحمان کی بیٹی کے ساتھ مبینہ مراسم تھے اور چند روز قبل زبیر مولوی ہدایت الرحمان کے گھر میں گھسا تھا۔ غلام سرور کے مطابق میرے بیٹے کے جرم میں مقامی افراد پر مشتمل پنچائیت نے اس کو مقامی مسجد میں طلب کیا جہاں ملک اختر ولد شاہجہان، شادی خقان ولد ملک اختر، ستار، غفار پسران غلام رسول، رمضان اور سعید پسران حیدر کے علاوہ مولوی ہدایت الرحمان موجود تھے۔ ملزمان نے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کے گناہ کے بدلے اپنی کمسن 4 سالہ بیٹی دعا ایمان کا نکاح 22 سالہ نوجوان سعید ولد حیدر سے کردے۔ ملزمان نے زبردستی میری بیٹی کا نکاح سعید سے پڑھایا اور مجھے کسی کے سامنے زبان کھولنے پر جان سے مارنے سمیت سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں۔ پہاڑ پور پولیس نے غلام سرور کی رپورٹ پر نکاح خواں مولوی ہدایت الرحمان اور پنچائیت کے سربراہ ملک اختر سمیت 7 ملزمان کے خلاف مقدمہ درج کرلیا۔

(نامہ نگار)

50 خواتین، 28 مرد نام نہاد غیرت کے نام پر قتل

کراچی کراچی: قانون نافذ کرنے والے اداروں اور فوجداری انصاف کے نظام کو درپیش متعدد چیلنجز کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ بنیادی طور پر سندھ کے دیہی علاقوں میں نام نہاد غیرت یا کاروکاری کے نام پر قتل کے واقعات بلا روک ٹوک جاری رہے اور رواں سال کے پہلے 6 ماہ کے دوران 70 سے زائد لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ اس طرح کے بیشتر کیسز میں تحقیقات بے نتیجہ رہیں اور کسی کو بھی انصاف کے کٹہرے میں نہیں لایا گیا جب کہ کچھ ملزماں کو بری کرنے کی اجازت دی گئی۔ ڈان اخبار کی رپورٹ کے مطابق سرکاری اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ جنوری سے جون 2019 تک سندھ کے مختلف حصوں میں 78 لوگ قتل ہوئے جبکہ کاروکاری کے نام پر 65 کیسز رجسٹرڈ ہوئے، تاہم ان میں سے 90 فیصد کیسز مختلف وجوہات کے باعث زیر التوا ہیں۔ اس کے علاوہ زیادہ تر کیسز میں پولیس کی تحقیقات کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی۔ ادھر ذرائع نے اعداد و شمار کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ 'ان 78 متاثرین میں سے 50 خواتین اور 28 مرد ہیں'، سندھ کے 'مختلف حصوں میں نام نہاد غیرت کے نام پر قتل کی کل 65 ایف آئی آر درج ہوئیں اور ان میں سے 60 کیسز میں چارج شیٹ فائل کی جا چکی، تاہم اب بھی 57 مقدمات زیر التوا ہیں اور کسی کیس میں کوئی سزا نہیں ہوئی لیکن اس سب عمل کے دوران 3 لوگ بری ہوئے جبکہ زیادہ تر کیسز میں ملزم متاثرین کے قریبی رشتے دار ہیں'۔ تاہم انسپکٹر جنرل (آئی جی) سندھ پولیس ڈاکٹر سید کلیم امام کی زیر صدارت حالیہ اجلاس میں غیرت کے نام پر قتل کے مقدمات میں تحقیقات سے متعلق پولیس کے تنظیمی ڈھانچے میں تشویش پائی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ گزشتہ ماہ آئی جی کلیم امام نے کاروکاری سے متعلق تفتیش میں پولیس کی کارکردگی کا جائزہ لیا تھا۔ دوسری جانب سندھ پولیس کے انسپکٹر جنرل نے تفتیش کاروں کو ہدایت دی کہ وہ صوبے بھر میں غیرت کے نام پر قتل کے کیسز میں سزا اور رہائی سے متعلق ہر کیس کی بنیاد پر تفصیلی رپورٹ تیار کریں۔ ساتھ ہی انہوں نے متعلقہ حکام کو یہ ہدایت دی کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ تفتیش میں کوئی خامی نہ رہے اور عدالتوں کے سامنے بھی اس کو مناسب طریقے سے پیش کیا جائے۔ اسی اجلاس میں ڈی آئی جی سکھر کو کہا گیا کہ تمام اسٹیک ہولڈرز کو ساتھ لیں اور ان کی مشاورت سے ایک مسودہ تجویز دیں تاکہ کاروکاری کی لعنت کو ختم کرنے میں مدد ملے۔ واضح رہے کہ حکام کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کی تنظیموں کی جانب سے سخت تنقید کے باوجود یہ گھناؤنا رجحان جسے دیہی نظام کا حصہ قرار دیا جاتا ہے، بلا روک ٹوک جاری ہے، تاہم پولیس کے لیے اس طرح کے قتل کی موثر طریقے سے تفتیش کرنا مشکل ہے کیونکہ زیادہ تر معاملات میں متاثرین اور ملزمان ایک ہی خاندان یا قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈی آئی جی ہیڈ کوارٹرز عبدالخالق شیخ کا کہنا تھا کہ 'غیر کے نام پر قتل ایک سماجی مسئلہ ہے اور اس کی جڑی اس قبائلی ثقافت اور ذہنیت میں موجود ہیں، جہاں خواتین کو مردوں کے تابع سمجھا جاتا ہے'۔ انہوں نے کہا کہ 'معاشرے میں خواتین کو بااختیار بنانے اور اس طرح کی ذہنیت کی تبدیلی میں ایک طویل مدتی حل مضمر ہے، جہاں تک فوجداری انصاف کے جواب کا تعلق ہے تو محکمہ پولیس نے ان نام نہاد غیر کے نام پر قتل سے نمٹنے کے لیے کئی مفید اقدامات اٹھائے ہیں، جس میں یو این ڈی پی کے اشتراک سے غیر کے نام پر ہونے والی ہلاکتوں کو روکنے کے منصوبے پر عمل درآمد اور پولیس افسران کو حساس بنانے کے لیے تربیتی ماڈیول شامل ہے'۔ ساتھ ہی ان کا کہنا تھا کہ سینٹرل پولیس آفس (سی پی او) میں سینٹرلائزڈ انسانی حقوق سیل قائم کیا گیا ہے جو اس طرح کے واقعات یا کیسز کی نگرانی کر سکیں۔ تاہم ڈی آئی جی عبدالخالق شیخ کا کہنا تھا کہ 'استغاثہ، پولیس اور عدلیہ کے مابین زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی کی ضرورت ہے کیونکہ پراسیکیوٹرز اور ججز کو اس طرح کے قتل کے مقدمات کی خصوصی سمجھنے کے لیے تربیت کی ضرورت ہے، جہاں قتل کا مقصد نام نہاد غیرت ہو'۔ علاوہ ازیں انسانی حقوق کی تنظیموں اور قانون سازوں کا ماننا ہے کہ متعلقہ خاندانوں کے رویوں اور تحقیقات میں خامیوں کے علاوہ پولیس کا 'غیرت' کے نام پر قتل کے مقدمات کی طرف نقطہ نظر اور مجموعی طور پر فوجداری انصاف کے نظام میں اصلاحات کی ضرورت ہے۔ انہوں نے قوانین میں بہت زیادہ تبدیلیوں کا مطالبہ کیا تاکہ اس سفاکانہ رجحان کے لیے ثقافت کو ذمہ دار ٹھہرانے کے بجائے اصل قصورواروں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جا سکے۔ (انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان)

طالب علموں پر مبینہ تشدد

ٹوبہ ٹیک سنگھ ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ ڈگری کالج میں طالب علموں کو تشدد کا نشانہ بنانے کے خلاف طالبعلموں اور اساتذہ نے احتجاج کیا۔ طالبعلموں نے الزام عائد کیا ہے کہ ٹیچر نوید اسلم نے انہیں بلاوجہ تشدد کا نشانہ بنایا اور کالج سے نکل جانے کا کہا۔ دوسری جانب ٹیچر نوید اسلم کی جانب سے طالب علموں کو بلاوجہ تشدد کا نشانہ بنانے کے خلاف کالج کے اساتذہ نے کلاسز کا بائیکاٹ کیا اور طلبہ کا ساتھ دیتے ہوئے احتجاج کرتے ہوئے انتظامیہ سے مطالبہ کیا کہ نوید اسلم کے خلاف فوری طور پر ایکشن لیا جائے۔ اساتذہ نے خبردار کیا کہ اگر نوید اسلم کے خلاف کارروائی نہ کی گئی تو کالج کو غیر معینہ مدت کے لئے بند کر دیا جائے گا۔

(اعجاز اقبال)

سینکڑوں ماربل فیکٹریاں گندا پانی ندیوں میں پھینکنے لگیں

بونیر ضلع بونیر میں قائم چار سو سے زائد ماربل فیکٹریاں زہر اگل رہی ہیں، ہر فیکٹری مالک نے گندے پانی کا رخ صاف پانیوں کی ندیوں اور خوڑوں کی جانب موڑ کر انہیں بھی زہریلا کر دیا ہے جس کی وجہ سے مویشی بھی اب یہ پانی نہیں پیتے جبکہ ان ندیوں میں صدیوں سے موجود مشہور مہاشیر مچھلی کی نسل بھی معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ ضلعی انتظامیہ اور محکمہ ماحولیات نے اعلیٰ عدالتوں کے واضح احکامات کو پس پشت ڈال کر ماحولیاتی آلودگی پھیلانے والی سینکڑوں ماربل فیکٹری مالکان کو بونیر کے لاکھوں لوگوں، جانوروں اور آبی حیات کو خطرات سے دو چار کرنے کی اجازت دے رکھی ہے، سماجی و سیاسی حلقوں نے سپریم کورٹ و ہائی کورٹ کے واضح احکامات پر عمل درآمد نہ کرنے پر ضلعی انتظامیہ، محکمہ موحولیات اور دیگر متعلقہ محکموں کے خلاف سخت ایکشن لینے اور فیکٹریوں کے آلودہ پانی کو پہلے تین سیفٹی ٹینکیوں سے گزارنے کا پابند بنانے کا مطالبہ کیا ہے۔ (روزنامہ ایکسپریس)

فائرنگ سے رہنماء جاں بحق

باجوڑ 28 اکتوبر 2019ء کو باجوڑ میں نامعلوم افراد کی فائرنگ سے جے یو آئی (ف) کے سینئر رہنماء مفتی سلطان محمد زخمی ہوگئے انہیں سی ایم ایچ پشاور منتقل کیا گیا جہاں وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ذرائع کے مطابق پیر کے دن علی الصبح ضلع باجوڑ کی تحصیل وڑ ماموند کے علاقہ بدان میں برکلی مسجد کے قریب نامعلوم افراد نے جمعیت علمائے اسلام (ف) کے سینئر رہنماء اور سابق امیدوار صوبائی اسمبلی مفتی سلطان محمد پر اس وقت فائرنگ کی جب وہ نماز فجر کی ادائیگی کیلئے مسجد جا رہے تھے۔ فائرنگ کے نتیجے میں مفتی سلطان محمد شدید زخمی ہوگئے جنہیں فوری طور پر مقامی لوگوں نے علاج معالجے کیلئے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال خار منتقل کر دیا، دوپہر کے بعد انہیں مزید علاج کیلئے بذریعہ ہیلی کاپٹر پشاور منتقل کر دیا گیا، ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر باجوڑ پیر شہاب علی شاہ کے مطابق مفتی سلطان محمد کو تین گولیاں لگی ہیں اور ملزمان کی تلاش جاری ہے، دریں اثناء جمعیت علمائے اسلام (ف) باجوڑ کے زیر اہتمام مفتی سلطان محمد پر قاتلانہ حملے کے خلاف خار بازار میں احتجاجی مظاہرہ بھی کیا گیا۔

(نامہ نگار)

نقیب اللہ محسود کی ہلاکت کی عکاسی کرنے والے فن پاروں کی نمائش بند کروانے کی کوشش

کراچی 27 اکتوبر 2019 کو پاکستان میں ماورائے عدالت قتل کے موضوع پر فن پاروں کی ایک نمائش کو 'سادہ کپڑوں میں ملبوس' کچھ افراد نے یہ کہہ کر بند کروانے کی کوشش کی ہے کہ 'انھیں یہ کام پسند نہیں آیا۔' اتوار کو 'کلنگ فیلڈز آف کراچی' کے نام سے ان فن پاروں کی نمائش کراچی کے فریئر ہال میں 'کراچی بینالے' کے تحت منعقد ہونے والی تقریب میں ہوئی تھی۔ یہاں عدیلہ سلیمان کی جانب سے نقیب اللہ محسود کے والد پر مبنی ویڈیو انسٹالیشن اور 444 قبروں کے پلر بنائے گئے ہیں جن پر لوہے کے مرجھائے ہوئے پھول رکھے گئے ہیں۔ اس 'کلنگ فیلڈ' یا قبروں کے ذریعے آرٹسٹ عدیلہ کے مطابق انھوں نے کراچی میں 444 افراد کے مبینہ مقابلوں میں ہلاک ہونے کے دعوے کو دکھایا ہے۔ ہال کے اندر ایک فلم کے علاوہ باہر علامتی قبریں موجود ہیں جن میں ایک پر محمد علی جناح کی تصویر بھی موجود ہے۔ عدیلہ کے مطابق جس فارم میں نقیب کو ہلاک کیا گیا اس میں یہ تصویر موجود تھی اور انھوں نے اس کی عکاسی کی ہے۔ جب بی بی سی نے ڈی آئی جی پولیس شرجیل کھرل سے رابطہ کیا تو انھوں نے اس واقعے کے حوالے سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ دوسری طرف آرٹسٹ عدیلہ کا کہنا ہے کہ فی الحال انھوں نے اس کے ردعمل میں پولیس سے رابطہ نہیں کیا۔ عدیلہ سلیمان کے مطابق ویڈیو انسٹالیشن میں انھوں نے ایسے جذبات کو اجاگر کیا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ نقیب اللہ محسود کے والد سمندر کی طرف دیکھ رہے ہیں اور خاموش ہیں۔ 'میں نے وہ فارم ہاؤس دکھایا ہے جس میں نقیب اللہ کو ہلاک کیا گیا تھا اور دوسری جانب شہر کی عام زندگی دکھائی ہے۔' آرٹسٹ عدیلہ کہتی ہیں کہ اس فن پارے سے متعلق ان کی ساری تحقیق صحافیوں کی رپورٹس پر مبنی ہے۔ عدیلہ سلیمان نے بی بی سی کو بتایا کہ اتوار کی صبح دس بجے جیسے ہی نمائش کا آغاز ہوا تو سادہ لباس میں ملبوس کچھ لوگ آئے اور کہنے لگے کہ 'ہم انٹیلیجنس ادارے سے ہیں۔' انھوں نے بتایا کہ 'ان لوگوں نے ادارے کا نام نہیں بتایا اور کہا کہ یہ نمائش بند کریں۔' جب عدیلہ نے ان سے پوچھا کہ 'نمائش کو کیوں بند کریں؟' تو جواب میں 'انھوں نے فون پر ایک نمبر ملایا اور کہا کہ ہمارے صاحب سے بات کریں۔ لیکن ان 'صاحب' نے بات نہیں کی، جس کے بعد ہال انتظامیہ پر دباؤ ڈال کر ہال بند کروا دیا گیا۔' وہ کہتی ہیں کہ 'اب باہر موجود علامتی قبروں کے فن پاروں کو بھی ہٹانے کے لیے کہا جا رہا ہے۔' تقریب کے ایڈمنسٹریٹر محمد سلیم کا کہنا ہے کہ وہ تاخیر سے آئے اور ان کے ماتحت نے انھیں بتایا کہ 'کچھ لوگ آئے تھے۔ انھیں یہ کام پسند نہیں آیا تھا۔ انھوں نے بند کروا دیا جبکہ باقی نمائش جاری ہے۔' عدیلہ کے مطابق قبروں کے فن پاروں کو بند کرنے کا کہا گیا تھا۔ فی الحال ہال کے اندر اس کمرے کو بند کر دیا گیا ہے جہاں فن پاروں کی نمائش ہو رہی تھی تاہم باہر کا حصہ اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ یاد رہے کہ جنوری 2018 میں نقیب اللہ محسود کو سابق ایس ایس پی راؤ انوار نے ایک پولیس مقابلے میں ہلاک کرنے کا دعویٰ کیا تھا اور ان کا تعلق شدت پسند تنظیم سے ظاہر کیا تھا۔ لواحقین نے ان کے اس دعوے کو مسترد کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ وہ ایک ماڈل اور عام نوجوان تھے۔ اس موقف نے فروغ حاصل کیا اور کراچی میں احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا جس کے بعد پولیس کی اعلیٰ سطح کی کمیٹی نے تحقیقات میں راؤ انوار کے موقف کو مسترد کیا تھا اور ان کی گرفتاری کی سفارش کی تھی۔ پشتون تحفظ موومنٹ سمیت متعدد جماعتوں نے اس ہلاکت کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ (بشکریہ بی بی سی اردو)

محکمہ داخلہ جی بی شیڈول فور سے کارکنوں کے نام ہذف کرنے سے انکاری

گلگت محکمہ داخلہ جی بی نے ان عدالتی احکامات کو کوئی اہمیت نہیں دی جن میں کہا گیا تھا کہ سیاسی وسماجی کارکنوں کے نام شیڈول چار سے ہٹائے جائیں۔ عدالت نے دوبار آرڈر جاری کیا تھا۔ چیف کورٹ نے پہلا آرڈر 23 اپریل 2019 کو جاری کیا تھا جس میں تین سیاسی وسماجی کارکنوں راجہ میر نواز میر، میر عنایت ابدالی اور یاور کے نام شیڈول چار سے نکالنے کی ہدایت کی۔ متاثرین نے عدالت میں اس کے لیے پٹیشن دائر کی تھی۔ جب محکمہ داخلہ نے ان کے نام شیڈول فور سے نکالنے سے انکار کر دیا تو متاثرین نے دوبارہ چیف کورٹ سے رجوع کیا۔ عدالت نے 3 ستمبر 2019 کو ایک بار پھر ہدایت کی کہ مذکورہ لوگوں کے نام شیڈول فور سے نکالے جائیں اور عدالتی آرڈر پر عمل درآمد کیا جائے مگر محکمہ داخلہ ابھی تک عدالتی آرڈر پر عمل درآمد نہیں کر رہا۔ جب متاثرین نے محکمہ داخلہ سے رجوع کیا تو محکمہ داخلہ کے اہلکاروں نے انہیں کہہ کہ وہ ایک حلف نامہ جمع کروائیں کہ وہ مستقبل میں سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیں گے اور کہا اگر وہ یہ حلف نہیں دیں گے تو پھر ان کے نام شیڈول فور سے نہیں نکالے جائیں گے۔ متاثرین کا کہنا ہے، 'ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جی بی ایسی جگہ ہے جہاں لاقانونیت کا راج ہے۔ مقامی انتظامیہ کی پوچھ گچھ کرنے والا کوئی نہیں اور وہ خود کو قانون سے بالاتر تصور کرتی ہے۔ انسانی حقوق کی قومی وعالمی تنظیموں سے اپیل ہے کہ وہ اس معاملے کو اجاگر کریں۔" یہ بات قابل ذکر ہے کہ جی بی میں کئی سیاسی وسماجی کارکنوں کے نام شیڈول فور (انسداد دہشت گردی ایکٹ 1997 کی دفعہ 11) میں ڈالے گئے ہیں تاکہ وہ مقامی لوگوں کے حقوق کے لیے آواز بلند نہ کریں۔ (اسرارالدین اسرار)

اس نے میٹنگ بلائی اور کہا
لوگ، دن رات کنٹرول میں ہیں
ٹیپ منہ پر لگائی اور کہا
سب بیانات کنٹرول میں ہیں
اس نے گولی چلائی اور کہا
سر جی، حالات کنٹرول میں ہیں
سب زمیں پر خدا کے نائب تھے
سب زمیں پر خدا کے نائب ہیں
وہ جو اپنی خوشی سے مارے گئے . . .
وہ جو اپنی رضا سے غائب ہیں . . .
(ادریس بابر)

نوجوان کی تشدد شدہ لاش برآمد

ٹوبہ ٹیک سنگھ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے علاقے نواں لاہور کے قریب پینتیس سالہ نوجوان کی تشدد شدہ لاش برآمد ہوئی ہے جسے تھانہ نواں لاہور پولیس نے قبضے میں لے کر پوسٹمارٹم کے لئے رول ہیلتھ سینٹر منتقل کر دی۔ پولیس ترجمان بتایا ہے کہ نوجوان کی شناخت ابھی تک نہیں ہو سکی تاہم نوجوان کے شناخت کیلئے پوسٹ مارٹم کے بعد نمونے ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے لاہور بھجوائے جا رہے ہیں۔ (اعجاز اقبال)

بچی پولیو کا شکار

ٹوبہ ٹیک سنگھ نواحی گاوں 346 گ ب کی مناہل بتول پولیو کا شکار ہوگئی جس کو ڈی ایچ کیو ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ بچی کے والد محمد حسین کے بقول مناہل کو پولیو کے قطرے باقاعدگی سے پلائے گئے ٹوبہ ٹیک سنگھ ڈسٹرکٹ کو گذشتہ تین سال سے پولیو سے پاک ضلع کا درجہ حاصل ہے لیکن آج پولیو کا کیس سامنے آنے پر پولیو کی ویکسین پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ دوسری جانب ڈینگی کے مریضوں میں بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اب تک ضلع بھر میں ڈینگی کے مریضوں کی تعداد بیس سے تجاویز کر گئی ہے۔ (اعجاز اقبال)

بھابھی کو قتل کر دیا

سوات یکم اکتوبر 2019ء کو مٹہ کے علاقہ چیریال کڑا مار میں دیور نے بھابھی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پولیس نے مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی ہے۔ سوات کی تحصیل مٹہ کے علاقہ چیریال کڑا مار میں رسول شاہ ولد قمر علی نے اپنی بھابھی 35 سالہ مسماۃ (ن) زوجہ سید محمد کو فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔ پولیس نے مقدمہ درج کر کے ملزم رسول شاہ کو گرفتار کر کے مزید تفتیش شروع کر دی۔ (نامہ نگار)

انسانی حقوق کا عالمی منشور

10 دسمبر 1948ء کو اقوام عالم نے انسانی حقوق کا مندرجہ ذیل عالمی منشور منظور کیا

دفعہ - 1 تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ -2 ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اور اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قومیت، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اس کے علاوہ کسی بھی شخص کے ساتھ اس کے علاقے یا ملک کی، سیاسی، عملی یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا اقدار اعلیٰ کے لحاظ سے کسی اور بندش کا پابند ہو۔

دفعہ - 3 ہر شخص کو اپنی آزادی، زندگی اور تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 4 کوئی شخص، غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی بھی شکل ہو، ممنوع ہوگی۔

دفعہ - 5 کسی شخص کو جسمانی اذیت، یا ظالمانہ انسانیت سوز، یا ذلت آمیز سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ - 6 ہر شخص کا حق ہے کہ ہر جگہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

دفعہ - 7 قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس اعلان کی خلاف ورزی میں جو بھی تفریق کی جائے یا جس تفریق کی بھی ترغیب دی جائے، اس سے بچاؤ کے سب برابر کے حقدار ہیں۔

دفعہ - 8 ہر شخص کو ان فعال کے خلاف جو دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کی نفی کرتے ہوں، بااختیار قومی عدالتوں سے موثر طریقے سے چارہ جوئی کرنے کا حق ہے۔

دفعہ - 9 کسی شخص کو من مانے طور پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 10 ہر شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق وفرائض کے تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے فیصلے کے بارے میں اسے ایک آزاد اور غیر جانب دار عدالت میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا موقع ملے۔

دفعہ - 11 (1) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری الزام عاید کیا جائے، اس وقت تک بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے جب تک کہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع اور تمام ضمانتیں نہ دی جا سکی ہوں۔

(2) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بناء پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اسے کوئی ایسی سزا دی جائے گی جو جرم کے ارتکاب کے وقت کی مقرر کردہ سزا سے زائد ہو۔

دفعہ - 12 کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط وکتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کو ایسے حملے یا مداخلت سے قانونی تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 13 (1) ہر شخص کو اپنی ریاست کی حدود کے اندر نقل وحرکت کرنے اور کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح اسے اپنے ملک میں واپس آ جانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ - 14 (1) ہر شخص کو عقیدے کی بنا پر ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(2) یہ حق ان عدالتی کارروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں کیا جا سکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف ہیں۔

دفعہ - 15 (1) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(2) کوئی شخص محض من مانے طور پر قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کو اپنی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار کیا جائے گا۔

دفعہ - 16 (1) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت، یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(2) نکاح فریقین کی پوری آزادی اور رضامندی سے ہوگا۔

(3) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حقدار ہے۔

دفعہ - 17 (1) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 18 ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اجتماعی یا انفرادی طور پر خاموشی یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ، اس پر عمل، اور اس کی عبادات اور رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ - 19 ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اور بلا کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہے اور جس ذریعے سے چاہے اور ملکی سرحدوں کے حائل ہوئے بغیر معلومات اور خیالات کا حصول اور ان کی ترسیل کرے۔

دفعہ - 20 (1) ہر شخص کو پرامن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ - 21 (1) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔

(3) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مماثل کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ - 22 معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو عملاً حاصل کرے، جو اس کی عزت اور شخصیت کی آزادانہ نشوونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ - 23 (1) ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب ومعقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(3) ہر شخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب ومعقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جا سکے۔

(4) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں، (ٹریڈ یونین) قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ - 24 ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے، جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے ساتھ مقررہ وقفوں پر تعطیلات میں شامل ہیں۔

دفعہ - 25 (1) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی صحت اور فلاح وبہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات، اور بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق شامل ہے۔

(2) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی کے بغیر پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ - 26 (1) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں مفت ہوگی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشوونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

(3) والدین کو اس بات کے تصفیہ کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ - 27 (1) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، فنون لطیفہ سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(2) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفادات کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، فنی یا ادبی تصنیف سے، جس کا وہ مصنف ہے، حاصل ہوتے ہیں

دفعہ - 28 ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہو سکیں جو اس اعلان میں شامل ہیں۔

دفعہ - 29 (1) ہر شخص پر معاشرے کے حق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشوونما ممکن ہے۔

(2) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے اور ایک جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح وبہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔

(3) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔

دفعہ - 30 اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جا سکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی نفی ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

نومبر

انسانی حقوق کے عالمی دن

2 نومبر	صحافیوں کے خلاف جرائم کے حوالے سے سزا سے استثنیٰ کے خاتمے کا عالمی دن
6 نومبر	جنگ اور مسلح تنازعات کے دوران ماحول کو نقصان پہنچانے کی ممانعت کا عالمی دن
10 نومبر	امن اور ترقی کے لیے سائنس کا عالمی دن
14 نومبر	ذیابیطس کا عالمی دن
16 نومبر	رواداری کا عالمی دن
16 نومبر (نومبر کا تیسرا اتوار)	ٹریفک حادثات کے متاثرین کی یاد منانے کا عالمی دن
19 نومبر	بیت الخلاء کا عالمی دن
20 نومبر	بچوں کا عالمی دن
20 نومبر (نومبر کی تیسری جمعرات)	فلسفے کا عالمی دن
21 نومبر	ٹیلی ویژن کا عالمی دن
22 نومبر	صنعت کاری کا عالمی دن
25 نومبر	خواتین کے خلاف تشدد کے خاتمے کا عالمی دن
29 نومبر	فلسطینی عوام سے اظہار یکجہتی کا عالمی دن

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
"ایوان جمہور" 107۔ ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
فون : 35838341-35864994 فیکس : 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ : www.hrcp-web.org
پرنٹر : مکتبہ جدید پریس، 14 ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15